نثری تقریریں

ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر

ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر

نام کتاب : ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر کی **نشری تقاریر**
مقرر : ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر زید مجدہٗ
اشاعت : اوّل
تاریخ اشاعت: جون 2006ء
زیر اہتمام : صاحبزادہ عزیر محمود الازہری
نظر ثانی : علامہ محمد انور نقشبندی
کمپیوٹر کمپوزنگ: حافظ محمد شاہنواز
تصحیح و ترتیب: ساجد حسین چوہدری
قیمت : Rs.120/=

ملنے کا پتہ

رکن الاسلام جامعہ مجددیہ آزاد میدان ہیرآباد حیدرآباد
022-2617086-2633794

فہرست

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۹۷۹ء میں ریڈیو پاکستان نے ''حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے مختلف تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اسمیں مختلف عنوانات پر گفتگو کرنے کے لئے حضرت قبلہ صاحبزادہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر صاحب زیدہ مجدہ کو مدعو کیا، آپ نے وہاں جو تقاریر فرمائیں جنکو ریڈیو پاکستان نے نشر کیا ان تقاریر کو مخلوقِ خدا کے عام استفادہ کے لئے طبع کرا کے ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر ریڈیو سے جو آپ کی تقاریر نشر ہوئیں ان کو بھی اس میں شامل کیا جا رہا ہے۔ امید ہے بندگان خدا کی رہبری اور ہدایت کے لئے یہ تقاریر کا مجموعہ نہایت مفید اور نفع بخش ثابت ہوگا۔

اسلامی ضابطہ حیات حقوق اور فرائض میں

دنیا میں آج جتنے بھی مذاہب اور ادیان ہیں جب ہم ان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ چیز واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہر مذہب کے بانی اور اس کے پیروکار نے سوسائٹی سے علیحدہ ہو کر اپنے سکون کا راستہ تلاش کیا اور معاشرہ سے بالکل قطع تعلقی کر لینے کو اپنی منزل مقصود کا ایک زینہ تصور کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شہزادہ گوتم اپنی نوجوان بیوی اور نوزائیدہ بچے کو سوتا چھوڑ کر رات کی تاریکی میں جنگلوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ ادھر ''دیدبیاس'' کو دیکھتے ہیں کہ وہ آبادی اور معاشرے سے نفرت کرتا ہوا اپنے ماں باپ کو تن تنہا چھوڑ کر بیابانوں اور ویرانوں کا رخ کر لیتا ہے، ادھر ہم جوگیوں، رشیوں، سنیاسیوں، بیراگیوں کو بستیوں سے دور دھونی لگائے، جٹیں لٹکائے، آسن جمائے پہاڑوں اور غاروں میں تن تنہا اپنی ریاضتوں میں مصروف دیکھتے ہیں۔

الغرض ہر مذہب والا آبادیوں سے اور بستیوں سے دور رہ کر اپنے روح کے سرور کو تلاش کرتا ہے لیکن ''اسلام'' یہ وہ ایک واحد آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے جو انسان کو معاشرہ اور سوسائٹی میں رکھ کر پھر اس کو راحت اور سکون کی زندگی عطاء کرتا ہے اور اس کا طریقہ وہ صرف دو لفظوں میں بیان کرتا ہے کہ ایک ہوتے ہیں خالق کے حقوق، جنہیں ''حقوق اللہ'' کہا جاتا ہے، اور ایک ہیں بندے کے حقوق، جنہیں ''حقوق العباد'' کہا جاتا ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ تم یہ دونوں حقوق ادا کرو جب وقت آئے حقوق اللہ کا تو اس کے لئے کمربستہ ہو جاؤ اور جب وقت آئے

حقوق العباد کا تو اس کو بھی بخوشی بجالاؤ اور پھر دیکھو کہ تم کس طرح فرحت واطمینان
کے ساتھ معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہو، اس لئے کہ ان حقوق کو ادا کرنے
والا معاشرہ ایسا پرسکون اور طمانیت بخش ہوتا ہے کہ اس میں رہنے والے کو کبھی کوئی
تکلیف اور ایذاء نہیں پہنچ سکتی۔ پھر تو غاروں اور پہاڑوں اور عزلت کدوں میں بھی
آرام اور سکون نہ ہوگا جو تمہیں اس پرسکون معاشرے میں نصیب ہوگا۔

پھر یہ معاشرہ ایک دوسرے کو کھا جانے والا نہ ہوگا بلکہ جان بلب مریضوں
کے لئے نوید مسیحا ہوگا، یہ معاشرہ ایک دوسرے کو دشمن بنانے والا نہ ہوگا بلکہ ازلی
دشمنوں اور خون کے پیاسوں کو ایک دوسرے کا جگری یار بنانے والا ہوگا۔ ہاں! یہی
معاشرہ بدامنی اور فساد کا مرکز نہیں بلکہ امن وآتشی کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور کیوں نہ
ہو، جس معاشرے میں ہر حقدار کے حق کو ادا کیا جاتا ہو جہاں ہر ذی حق کو اس کے
جائز حق سے محروم نہ رکھا جاتا ہو وہاں پھر بھلا بدامنی اور بے چینی کب قائم رہ سکتی
ہے، اس لئے کہ بے چینی اور بے اطمینانی حق نہ ملنے پر ہوتی ہے، جب ہر ایک کو اس
کا حق مل گیا تو پھر بے چینی اور بے اطمینانی کا کیا سوال؟

والدین کے حقوق:

ذرا غور فرمائیں اور تصور کریں کہ وہ کتنا پاکیزہ معاشرہ ہوگا جہاں یہ
فرما کر والدین کے حقوق بتائے جا رہے ہیں کہ "**ولا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما**" فرمایا کہ والدین کو برا بھلا کہنا تو
درکنار ان کو اف بھی نہ کرنا اور نہ انکے ساتھ سختی سے بات کرنا بلکہ ہمیشہ تعظیم اور ادب

کے ساتھ پیش آنا۔ ادھر حدیث شریف میں آتا ہے کہ ماں باپ کا نافرمان اور احسان جتانے والا اور شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا (مشکوٰۃ بحوالہ سنن نسائی سنن دارمی باب البر والصلۃ) ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ جس نے بنیت ثواب محبت ومودت کے ساتھ اپنے والدین کے چہرے کو دیکھا اللہ تعالیٰ اس کو حج مبرور کا ثواب عطا فرمائیگا یہ سن کر ایک صحابی کو حیرت ہوئی اور انہوں نے تعجب سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اگرچہ سو مرتبہ دیکھے؟ آپ نے فرمایا "نعم اللہ اکبر اطیب" ہاں اگرچہ وہ دن میں سو مرتبہ ہی دیکھے خدا اس کو سو مرتبہ حج مبرور کا ثواب دیگا (مشکوٰۃ باب البر والصلۃ) اس لئے کہ وہ بھی بڑا ہے تو اس کی رحمت بھی بڑی ہے اس کی بھی انتہا نہیں تو اس کی وسیع رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اس کریم ورحیم کی بے پایاں رحمت سے کوئی چیز بعید نہیں، امیر مینائی اس کی شان کریمی کو اپنے انداز میں خوب بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

نگاہ کرم سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گنہگار ہوں میں
پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھ
گنہگار یہ کہہ دے گنہگار ہوں میں

اولاد اور بچوں کے حقوق:

پھر جہاں والدین کے حقوق بتائے گئے وہاں والدین کو بچوں اور اولاد کے حقوق سے بھی آگاہ کیا گیا چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بچہ سات روز کا ہو جائے
تو اس کا عقیقہ کرو اور اس کا نام رکھو، جب وہ چھ برس کا ہو جائے تو اس کو ادب سکھلاؤ
اور جب نو سال کا ہو جائے تو اس کو اپنے بستر سے جدا کر دو اور اس کو علیحدہ سلاؤ اور
جب وہ تیرہ برس کا ہو جائے تو اس کو نماز کی سختی سے تنبیہ کرو اگر نہ مانے تو مار کر نماز
پڑھاؤ ،اور جب وہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو تمہارا آخری حق یہ ہے کہ اس کی
شادی کر کے اس کو خدا کے سپرد کر دو۔ سبحان اللہ، چند لفظوں میں آپ نے حقوق اللہ
اور حقوق اولاد کا بڑے خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچ کے رکھ دیا (مکاشفۃ القلوب
لا امام غزالی ص ۶۳۴) ایک اور مقام پر روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم گوہر فشاں ہوتے
ہیں کہ "**لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا**" (مشکوٰۃ
بحوالہ ترمذی باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ص ۴۲۳) ''جو اپنے چھوٹوں پر شفقت اور
بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم سے نہیں'' اس پر خود عمل کر کے اس والی دو جہاں
نے ہمیں دکھایا کہ ممبر پر تشریف فرما ہیں اتنے میں امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہیں
سے دوڑتے ہوئے ادھر آ جاتے ہیں ان کو دیکھ کر آپ فوراً ممبر سے اتر پڑتے ہیں اور
ان کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتے ہیں۔

ایک دن خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سرکار کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں
ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بچی بھی ہے جو سرخ کرتا پہنے ہوئے ہے۔ آپ اس بچی
کو بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور بڑے پیار سے فرماتے ہیں سنہ، سنہ''
کیونکہ اس لڑکی کی پیدائش حبشہ میں ہوئی تھی اور حبشی زبان میں ''حسنہ'' اچھے اور
خوبصورت کو ''سنہ'' کہتے ہیں اس لئے اس مناسبت سے آپ نے اس کو ''سنہ'' فرمایا

بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ غیر معمولی چیز کو دیکھ کر اس سے کھیلنے لگ جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی اس بچی کی نظر جب نبی آخرالزماں کی پشت مبارک پر ابھری ہوئی ''مہر نبوت'' پر پڑی تو وہ بچی اس سے کھیلنے لگ گئی، باپ یہ دیکھ کر غصہ ہو گیا اور بچی سے ڈانٹ کر کہا کہ خبردار! بیٹا یہ بارگاہ نبوت ہے یہاں ادب سے بیٹھو! یہ سن کر فخر موجودات جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر خالد کو روک دیا کہ خالد، اس بچی کو کچھ مت کہو اسے یوں کھیلنے دو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۸۶)

شوہر کے حقوق:

اسی طرح عورت کو مرد کے حقوق سے آگاہ کیا گیا اور شوہر کی عزت وعظمت، تعظیم وتکریم کو صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا کہ ''سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں'' بظاہر یہ دو لفظ ہیں لیکن ان دو لفظوں میں معارف وحقائق کا ایک دریا موجزن ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے دوزخ میں سب سے زیادہ عورتوں کو دیکھا، صحابہ نے دریافت کیا آقا ایسا کیوں ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو عورتیں لعنت بہت کرتی ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ناشکری بہت کرتی ہیں، (صحیح بخاری کتاب النکاح باب کفران العشیر) ادھر عورتوں سے فرمایا تم اپنے شوہروں کی تلخ نوائی پر صبر کا گھونٹ پی کر چپ ہو لیا کرو کیونکہ ایسی صابرہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ فرعون کی نیک اور پاکباز بیوی حضرت آسیہ جیسا اجر عظیم عطا فرمائے گا (مکاشفۃ القلوب ص ۶۵۳)۔

بیوی کے حقوق:

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ نے مردوں کے حقوق سے عورتوں کو آگاہ فرمادیا لیکن مردوں کو عورتوں کے حقوق سے آگاہ نہیں فرمایا ایسا ہرگز نہیں بلکہ معاشرے میں رہنے والے ہر ذی حس اور ہر جاندار کا حق بتانے والے رحمۃ للعالمین نے بیویوں کے حقوق سے بھی مردوں کو متنبہ فرمایا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ "**خیرخیرکم لاھله وانا خیرکم لاھلی**" (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، دارمی، ابن ماجہ باب عشرۃ النساء) یعنی تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر سلوک رکھتا ہے اور میں تم سے زیادہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر برتاؤ رکھنے والا ہوں ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ اپنی بیوی کی تلخ بات تمہیں ناگوار گزرے تو اسے پی جایا کرو کیونکہ وہ شخص جو اپنی بیوی کی بری عادتوں پر صبر کرے گا کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو وہ ثواب عطاء فرمائے گا جو اس نے حضرت ایوب علیہ السلام کو بلاؤں کے صبر کرنے پر عطاء فرمایا، (مکاشفۃ القلوب ص ۶۵۳)

رشتہ داروں کے حقوق:۔

اسکے بعد مسلمان کی توجہ پورے خاندان کی طرف دلائی جاتی ہے ،اور عزیز واقارب کے حقوق کی اہمیت اور افادیت کو ان الفاظ میں آشکارا کیا جاتا ہے کہ ''جو شخص یہ چاہے کہ اس کی روزی فراخ ہو اور وہ طویل عمر پائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے (مکاشفۃ القلوب بحوالہ بخاری مسلم ص

۱۹۱)ایک اور فرمانِ رسول ہے کہ " کوئی فضیلت اس سے بڑھ کر نہیں کہ کوئی تم کو توڑے تو تم اس سے جوڑو"، " کوئی تم کو محروم کرے تو تم اس کو عطاء و بخشش سے مسحور کرو اور کوئی تم پر ظلم کرے تو تم اس پر رحم کرو اور اس کو معاف کردو" (طبرانی) حقیقت یہ ہے کہ ان چند الفاظ میں آپ نے گھریلو اور خاندانی زندگی کا راز بیان فرمادیا۔

ہمسائیوں کے حقوق:

خاندان کے حقوق کے بعد پڑوس میں رہنے والے ہمسائیوں کے حقوق کی طرف بھی خیال دلایا جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کا ہمسایہ اسکے شر سے محفوظ نہیں (صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لایأمن جارہ بوائقہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے آقا حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی کہ اے اباذر! جب تو کھانا پکائے تو اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال لیا کرتا کہ تھوڑا سا سالن تیرے پڑوسی کے لئے بھی نکل آئے (صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار) ۔

خادموں، غلاموں، اور ملازموں کے حقوق:

اس سے آگے بڑھ کر زیر دستوں، ماتحت خادموں، غلاموں اور ملازموں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کیا ہے لہٰذا اپنے ان ماتحتوں کو وہی کھانا دو جو تم خود کھاتے ہو، ان کو پہننے کے لئے وہی دو جو تم خود پہنتے ہو، ان سے ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت

سے باہر ہو (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم باب النفقات وحق المملوک)۔ گویا یہ تصور ذہن نشیں کرایا جارہا ہے کہ یہ وہ تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا زیردست اور ماتحت بنایا، اگر وہ چاہتا تو تم کو ان کا ماتحت بھی بنا سکتا تھا لہٰذا ان پر ان کی ہمت وطاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو، یہ وہ خیال حضور نے ہم کو دیا کہ اگر یہ ہمارے سامنے رہے تو کوئی افسر اور حاکم کسی بھی اپنے ملازم پر ظلم نہیں کرسکتا۔

ایک روز حضرت ابومسعود انصاری رضی االلہ تعالیٰ عنہ اپنے ایک ماتحت غلام کو اس کی کسی غلطی پر مارنے لگے کہ پیچھے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اچانک تشریف لے آئے اور فرمایا اے ابامسعود یہ مت بھول کہ تو جتنا اس غلام پر قادر ہے اس سے کہیں زیادہ خدا تجھ پر قادر ہے یہ سنکر ابومسعود نے اس غلام کو اسی وقت آزاد کردیا، آپ نے فرمایا اگر تو یہ نہ کرتا تو جہنم کا دروازہ تیرے لئے کھل گیا تھا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم باب النفقات وحق المملوک)۔

بالا دستوں اور حاکموں کے حقوق:

اب ماتحت غلاموں اور زیردستوں کے بعد بالا دستوں اور حاکموں کے حقوق کی باری آتی ہے اور حکم ہوتا ہے کہ اپنے افسروں، حکام اور اپنے بادشاہوں کی اطاعت کرو اگر شریعت کے مطابق تمہیں حکم دے رہے ہیں تو ان کے حکم کو سنو اور ان سے اس وفاداری اور اطاعت شعاری میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہ ہونے دو (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم کتاب الامارۃ والقضاء)

”**اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم**“ کا حکم ربانی بھی اس پر شاہد ہے۔

تمام مسلمانوں کے حقوق:

اب وہ اہل و عیال ،عزیز واقارب ،خدام ،ملازمین ،پڑوسی ،ہمسائے اور حکومت وقت کے تمام فرائض اداء کر کے ان سب کا پیارا بن گیا اب اس کو عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنایا جاتا ہے،اس کو محبوب عالم بننے کے لئے یہ طریقہ بتایا جاتا ہے کہ ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده'' (صحیح بخاری کتاب الایمان ج ا ص ٦) کہ تم صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کے اس وقت مستحق ہونگے جب تمہاری زبان اور تمہارے ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور ایذاء نہ پہنچے حتیٰ کہ ایک مقام پر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تمہارے لئے آنکھ سے ایسا اشارہ کرنا بھی جائز نہیں جس سے تمہارے مومن بھائی کے دل کو ٹھیس پہنچے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی چنانچہ قرآن فرماتا ہے "عزیز علیه ما عنتم" کہ اے مومنو! تمہارا تکلیف میں پڑ جانا تمہارے رسول پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری تکلیف اور بے چینی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔خود تکلیف دینا تو درکنار تمہیں اور کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

اقوام عالم کے حقوق:

اب اس حقوق کے دائرے کو وسیع کیا جاتا ہے اور اس کو وسعت دیکر تمام اقوام عالم بلکہ ساری انسانیت کے حقوق کو ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے "ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لاتعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی" دیکھو دیکھو! یہ خیال رکھنا کہ اگر کسی قوم سے تمہاری دشمنی ہو تو وہ دشمنی

اورعداوت تم کو بے انصافی کی طرف کہیں نہ لے جائے ، بلکہ دشمن سے دشمن قوم کے ساتھ بھی عدل وانصاف سے پیش آنا کہ عدل ہی خداترسی سے زیادہ قریب ہے ادھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عام انسانوں کے حقوق کو جامع الفاظ میں یوں بیان کرتی ہے کہ "**احب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما**" (جامع ترمذی ابواب الزہد) فرمایا حقیقی مسلمان بن جاؤ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو ذرا غور فرمائیں کہ ایسا کون شخص ہوگا جو اپنے لئے برائی پسند کرے گا، لہٰذا اس حدیث کی رو سے اگر اپنے لئے برائی پسند نہیں کرتے تو اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

ایک اور ارشاد رسول ہے کہ "**من يسّر على معسر يسر الله عليه في الدنيا و الآخرة**" (جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الستر علی المسلمین) کہ تم تنگ دستوں اور مصیبت کے ماروں پر آسانی کرو اللہ تعالیٰ تمہاری مشکلات کو آسان فرمادے گا۔ یہ ہیں وہ انسانیت کے ہر طبقہ کے حقوق جنہیں رہبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ہمیں بتایا بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا لیکن ہائے افسوس آج ہم ہر چیز میں ترقی کر رہے ہیں لیکن ان حقوق اور فرائض میں ہم پستی کی طرف جارہے ہیں۔ سچ کہا جگر نے

کیا قیامت ہے اس دور ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا نہیں ہوتا

آزادی رائے:

اس کے علاوہ ''حقوق انسانیت'' کا ایک عظیم پیچیدہ متنازع فیہ مسئلہ

''آزادی رائے'' کا ہے۔انسانیت کا یہ وہ عظیم مگر مظلوم حق ہے جس پر ہر دور میں ڈاکے ڈالے جاتے رہے۔لیکن اسلام نے بنی نوع انسان کو''آزادی رائے'' کا وہ حق عطاء کیا ہے جو آزادی انسانیت کا دم بھرنے والی بڑی بڑی قوموں اور جمہوریت کے بلند بانگ دعوے کرنے والے کسی ملک وملت نے انسان کو ایسا عطا نہیں کیا۔

اس کی مثال میں مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہیں۔آپ کے پاس یمن سے کچھ چادریں آتی ہیں۔جن کو آپ مسلمانوں پر تقسیم فرمادیتے ہیں۔سب کے حصے میں ایک ایک چادر آتی ہے،کچھ دنوں بعد دشمنان اسلام سے جہاد کی ضرورت پیش آگئی تو عمر بن الخطاب ممبر رسول پر کھڑے ہوکر لوگوں کو جہاد کا حکم دیتے ہیں۔حد نگاہ تک آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے کہ اچانک اس بھرے مجمعہ میں سے ایک''عام آدمی'' کھڑا ہوکر حضرت عمر کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ "**یاعمرُ لاسمعاً و لاطاعةً**"کہ اے عمر!تیری کوئی بات نہیں سنی جائے گی،اور نہ ہی تیری کسی بات کی اطاعت کی جائے گی۔

دنیائے انسانیت کا عظیم فرماں روا بجائے غصے اور برہمی کے تبسم ریز ہونٹوں کے ساتھ اس سے پوچھتے ہیں کہ "**ولِمَ ذالك**"کہ میرے بات نہ ماننے کی آخر کیا وجہ ہے؟وہ شخص جواب میں کہتا ہے کہ "**لانك استأثرت علينا**"اس لئے ہم تیری اطاعت نہیں کریں گے کہ تو نے اپنے آپ کو ہم پر ترجیح دی ہے''عمر پھر بڑے تحمل کے ساتھ اس سے پوچھتے ہیں کہ "**بایّ شیء استأثرت**" وہ کونسی چیز ہے جس میں میں نے تم غریبوں پر اپنے آپ کو ترجیح دی ہے؟وہ ہی شخص تفصیل بیان کرتا ہوئے کہتا ہے کہ''یمن'' سے جو چادریں آئی تھیں ان کو جب تو نے تمام مسلمانوں میں تقسیم

کیا تو ہر ایک کے حصے میں ایک ایک چادر آئی تھی لہٰذا تیرے حصے میں بھی ایک ہی چادر آنی چاہیۓ تھی جبکہ ایک چادر سے تیرا کرتہ پورا بن نہیں سکتا حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ہی چادر کا تو پورا ایک لمبا کرتہ پہنے کھڑا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو نے ایک کے بجائے دو چادریں لی ہیں،تو جواب دے کہ یہ دوسری چادر تو نے زیادہ کیوں لی؟

عالم اسلام کے امیر المؤمنین، دنیا کا عظیم فرماں روا جسے آج بھی یورپ جرنل عمر کے نام سے یاد کرتا ہے جس کی ہیبت سے شہنشاہ روم کے قاصد پر بھی کپکپی طاری ہو جائے، وہ مصطفیٰ کا غلام یعنی فاروق اعظم اس غریب کو جواب دیتے ہیں کہ اے میرے دوست تیرا اعتراض درست ہے،سوال کا جواب میرا بیٹا عبداللہ تجھے دے گا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھری محفل میں کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ جب میرے والد نے اپنے حصے کی ایک چادر سے اپنا کرتہ سلوانے کا ارادہ فرمایا تو یہ چادر ان کو چھوٹی پڑی تو اس وقت میں نے اپنی چادر ان کو پیش کر دی جس کو ملا کر انہوں نے اپنا کرتہ سلوایا ہے، یہ سن کر وہ شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ "**امـــــا الآن فـالسـمـع والـطـاعـة**" ہاں اب تیری بات بھی سنی جائے گی اور جو تو کہے گا اس کی اطاعت بھی کی جائے گی۔ (الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۴۷)''آزادی رائے کے متعلق تاریخ اسلام کا یہ وہ واقعہ ہے کہ اس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

بہر حال ''حقوق فرائض'' کے متعلق اسلام کا بتایا ہوا یہ وہ ضابطۂ حیات'' ہے جس پر اگر انسان عمل پیرا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اسکی نجی اور خوانگی زندگی باغ و بہار بن جائیگی بلکہ پورا معاشرہ، اور ساری انسانیت چمن زار بنتی چلی جائیگی۔

ادائیگی حقوق میں توازن

کسی بھی عمل میں اگر افراط وتفریط سے کام لیا جائے تو اس عمل کا حسن ختم ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تمام حقوق میں خواہ اسکا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے ہو افراط وتفریط سے اجتناب کرنے اور انکے درمیان توازن برقرار رکھنے کا حکم دیا، چنانچہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "**ما احسن القصد فی الغناء ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادة**" (کنز العمال ج ۲ ص ۷) یعنی دولتمندی اور تونگری میں میانہ روی کتنی اچھی چیز ہے، محتاجی میں بھی میانہ روی کتنی اچھی چیز ہے، اور عبادت میں بھی میانہ روی کتنی اچھی چیز ہے اس سے زیادہ عموم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اتنے ہی کام کو اپنے اوپر لازم کیا کرو جتنا تم کرسکو (صحیح بخاری مع فتح الباری جلد ا ص ۲۵۶) گویا آپ نے ارشاد فرمادیا کہ زندگی کا کوئی سا بھی گوشہ ہو اور کسی کا بھی تم حق اداء کررہے ہو خواہ وہ اللہ کا ہو یا بندہ کا ہو نہ تو اسمیں اتنی کمی کرنا کہ وہ اداء ہی نہ ہو اور نہ اسمیں اتنی زیادتی اور شدت اختیار کرنا کہ دوسرے حقوق تلف ہونے شروع ہو جائیں مثلا، ایک حق انسان پر اسکے نفس کا بھی ہے، اگر وہ کسی کی اطاعت اور خدمت کررہا ہے یا اللہ کی عبادت ہی کیوں نہ کررہا ہو اسکو حکم ہے کہ وہ اتنی زیادہ نہ کرے کہ وہ اپنی جان کو ہلکان کردے اور اپنے جسم کو نڈھال کردے۔

چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو جنہوں نے اپنی تمام تمام راتیں

نمازوں میں اور دن روزوں میں بسر کرنے شروع کردیئے تھے ،آپ نے ایسا کرنے سے منع کردیا اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حقوق ہیں (صحیح بخاری کتاب الصوم) اسی طرح اگر کوئی شخص یتیموں ،غریبوں اور بے نواؤں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کیلئے قرآن حکم دیتا ہے کہ بیشک ان پر ضرور مال خرچ کرو لیکن دیکھنا اس میں بھی توازن برقرار رکھنا اور اتنا مت خرچ کر ڈالنا کہ پھر تمہارے پاس کھانے کو بھی کچھ نہ رہے ۔اور تمہیں دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آجائے ،اسی طرح اگر تم بیوی کے حقوق اداء کرتے ہو تو اسمیں اتنا انہماک نہ ہو کہ اپنے والدین کا بھی کچھ خیال نہ رہے اور انکو بالکل چھوڑ بیٹھو بلکہ پہلے انکا خیال کرو، ہر کام میں اولیت ماں باپ کو دو کہ آج انہی کے صدقہ میں تم اتنے بڑے ہو کر اس مقام پر پہنچے ہو لیکن یہاں بھی ادائیگی حقوق میں توازن دونوں طرف سے ہونا چاہئے یہ بھی نہ ہو کہ والدین کے کہنے پر اپنا ہرا بھرا گھر تباہ کردو اور اپنی شریکہ حیات کی مسلسل حق تلفی کر کے اپنی اور اسکی زندگی میں کانٹے بھر دو، اسی لئے شریعت مطہرہ میں شوہر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ تمہارے متعلقین کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تو اسکو کسی علیحدہ مکان یا اسی مکان کے علیحدہ حصہ میں اپنی استطاعت کے مطابق رکھو اور ایک ہی جگہ سکو رکھنے پر اصرار کر کے خواہ مخواہ حق تلفی کر کے تلخیوں میں اضافہ نہ کرو۔

اعتدال اور میانہ روی

کنز العمال شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ما احسن القصد فی الغنی ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ" (کنز العمال ج ۲ ص ۷) کہ دولتمندی میں میانہ روی کتنی اچھی ہے اور فقر میں میانہ روی کتنی اچھی ہے اور عبادت میں میانہ روی کتنی اچھی ہے اس حدیث سے یہ پتا چلا کہ اسلام ہر چیز میں اعتدال کو پسند کرتا ہے دولتمندی اور امیری میں اعتدال اور میانہ روی کو اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا فرمایا کہ اگر انسان کے پاس بے پناہ دولت آجائے تو وہ عیش و عشرت اور آرام، بنگلوں اور ائر کنڈیشنڈ کاروں میں بیٹھ کر غریبوں اور محتاجوں کی تکلیفوں کو بھول جاتا ہے انکی ضروریات اور حاجات کا اسکو احساس تک نہیں ہوتا اور غریب تو غریب پیسہ آنے کے بعد تو انسان رشتہ داروں حتی کہ اپنے ماں باپ کو بھی بھول جاتا ہے اور جب یہ فانی دولت نشہ بن کر اسکے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ تو پھر وہ ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور اب خدا کو بھول جاتا ہے اسکے احکامات کو بھی فراموش کر دیتا ہے اور نعمتوں پر بجائے شکر ادا کرنے کے اسکے واجبات کی بجا آوری سے انکار کر کے ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے اور بعض دفعہ قہر خداوندی اسکو آلیتا ہے اور اسکی یہی ناشکری اسکی محرومیوں اور تباہیوں کا باعث بنتی چلی جاتی ہیں اس ہی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دولت بھی ہو تو اعتدال کے ساتھ تاکہ وہ حق سے غافل نہ کر دے اور کہیں اسکی زیادتی خدا کی ناشکری اور ناسپاسی کا باعث نہ بن جائے اسی

طرح فقر بھی اعتدال میں ہو اسلئے کہ اگر انسان حد سے زیادہ فقیر ہو جائے تو جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ اس کا فقر کہیں اسکو کفر تک نہ پہنچا دے۔ (مشکوۃ باب ما ینھی عنہ عن التہاجر)۔

وہ روز کے فاقوں سے تنگ آ کر کہیں اپنے مالک اور رازق کی طرف سے بدگمان نہ ہو جائے اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو ایمان کی دولت بھی اس کے ہاتھ سے چلی جائیگی اسلئے فرمایا کہ فقر بھی ہو تو وہ بھی اعتدال میں یا اس ارشاد والا کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر زیادہ فقر ہو تو انسان اپنی عزت نفس اور خودداری کو ختم کر کے ہر ایک کے آگے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بہت سے عمدہ اوصاف اور فضائل سے محروم ہو جاتا ہے اسلئے سرکار نے فقر کی زیادتی کو بھی برا سمجھا اور حد تو یہ ہے کہ عبادت جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا اسمیں بھی حد سے زیادہ کثرت کو پسند نہیں فرمایا بلکہ ''**ما احسن القصد فی العبادۃ**'' فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسمیں بھی اعتدال اور میانہ روی کا درس دیا اسلئے کہ اگر انسان عبادت میں بھی اعتدال نہ اپنائے اور دن رات عبادت میں مصروف ہو کر اپنے کام کاروبار اور اپنے تمام دھندوں تک کو ختم کر دے تو یہ بھی اچھا نہیں کیونکہ اگر ایسا کریگا تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالیگا اور اگر بالکل ہی کم کر دے تو حق سے غافل ہو جائیگا اور اسکے واجبات اور حقوق پوری طرح ادا نہ کر کے باعث لائق سزا ٹھہریگا اس لئے فرمایا گیا کہ عبادت میں بھی میانہ روی کو اختیار کرو۔

چنانچہ حضرت ابن عمر کا واقعہ کتب سیرت میں مشہور ہے کہ جب انہوں نے

تمام تمام رات نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کر دیے تو آپ نے انکوایسا کرنے سے منع فرمایااور اس عمل میں بھی اعتدال سے کام لینے کا حکم فرمایا(صحیح بخاری کتاب الصوم)الغرض اسلام زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال اور میانہ روی کے اصول پر انسان کو کار بند کرتا ہے مال خرچ کرنے سے لیکر اپنے اعضاء کی قوت صرف کرنے تک ہر چیز مین اعتدال کا درس دیتا ہے چنانچہ فیاضی او رسعادت کیسی عمدہ صفات ہیں لیکن اس میں بھی حکم ہوتا ہے کہ "**ولاتبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا**" کہ فیاضی میں اپنا اتنا مال مت خرچ کر دینا کہ پھر تمہارے پاس کچھ نہ بچے اور تم فقیر بن کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو بلکہ سخاوت میں بھی اعتدال کا پاس رکھو حتی کہ پانی ایک معمولی سی چیز ہے لیکن اس کے متعلق بھی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص دریا کے کنارہ پر بیٹھا ہوا ہو تو وہ وضو کرتے وقت زیادہ پانی نہ بہائے بلکہ یہاں بھی اعتدال سے کام لے حتی کہ چلنے پھرنے اور بولنے میں بھی ہمیں اسلام نے میانہ روی کا حکم دیا چنانچہ ارشاد ربانی ہے "**واقصد فى مشيك**" کہ اپنی چال کو نہ بہت تیز رکھ نہ بہت سست رکھ بلکہ درمیانی رفتار سے چلا کرو اور بولنے کے لئے بھی حکم ہے کہ بے تکی اور لغو باتوں میں اپنی زبان مت صرف کرو چنانچہ ارشاد رسول ہے کہ "**من حسن اسلام المرء تركه مالايعنينه**" : یعنی غیر ضروری باتوں کو ترک کر دینا اسلام کی خوبیوں میں داخل ہے۔(مجمع الزوائد للہیثمی ۸۔۱۸، مسند احمد بن حنبل ج ا ص ۲۰)

غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد

ترمذی شریف میں ہے کہ مخبر صادق روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد والا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں اسوقت تک رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے کسی بھائی کی مدد میں رہتا ہے (جامع الترمذی باب ماجاء فی السترعلی المسلمین) اس حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر آدمی کسی حاجت مند کی حاجت روائی میں مصروف ہو مشکل کے وقت اس کی مدد میں لگا رہے تو پھر اسکو اپنے مشکل سے مشکل کام کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسلئے کہ جسکا مددگار وہ رب ذوالجلال بن جائے پھر اس کیلئے کونسا ایسا کام ہے جو مشکل رہ سکتا ہے اور کونسی ایسی مہم رہ سکتی ہے جو سر نہ ہو سکے بلکہ جب کسی کی مدد کرنے کے باعث خدا کی طرف سے غیبی مدد پہنچے گی تو پھر بگڑے ہوئے کام بھی بنتے چلے جائیں گے اور ترقی اور ارتقاء کے دروازے خود بخود اس کیلئے وا ہو جائیں گے ،اسکے عملی ثبوت کیلئے ہمارے سامنے حضرت عمر بن الخطاب ؓ کی سیرت مقدسہ موجود ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں امیرالمومنین ہونے کے باوجود گھر گھر جاکر لوگوں کی حاجتیں رفع کیں رات رات بھر پھر کر غریبوں کی تکلیفیں دور کیں اور بھیس بدل بدل کر حاجتمندوں کی حاجتوں کو معلوم کیا اور پھر انکی حاجت روائی فرمائی۔

الغرض جہاں آپ نے یہ فرماکر اس احساس ذمہ داری کا اظہار فرمایا کہ ''اگر فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی پیاسا مر گیا اور میں نے اپنی سلطنت اور

حکومت میں اس کی حاجت پوری نہ کی تو کل قیامت کے دن عمر کو اسکا بھی جواب دینا پڑے گا، وہاں آپ نے اس احساس ذمہ داری کو پوری طرح نبھا کر بھی دکھایا اور مخلوق خدا کی اس اس طرح حاجت روائی فرمائی کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے تو عرض کرنیکا مقصد یہ تھا کہ جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مخلوق خدا کی اسطرح مدد کی تو پھر خدا نے بھی اپنے وعدہ کے مطابق انکی ایسی مدد فرمائی کہ قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں انکے قدموں میں آ گئیں اور جس طرف انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھ لی بڑے بڑے تخت و تاج ان کیلئے فرش راہ بنتے چلے گئے۔

اسکے علاوہ اسلام سے قبل بڑے بڑے سلاطین پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی چیز دکھائی دے گی کہ انہوں نے ابھی حاجت روائی اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے اصول کو اپنی زندگی بنالیا اور اس کے ذریعہ دنیا پر حکومت کی چنانچہ کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ سکندر ذوالقرنین ایک روز صبح سے شام تک اپنا دربار لگا کر بیٹھا لیکن اس دن شام تک کوئی حاجت مند اپنی حاجت لیکر اس کے پاس نہیں آیا اسکا اسکو اتنا افسوس تھا کہ جب مجلس برخواست ہوئی تو اپنے مصاحبین سے کہنے لگا کہ آج کا دن میں اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔ سب نے پوچھا کہ اسکی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ آج کا دن بڑے آرام اور سکون کا دن تھا، سلامت و کرامت اور طمانیت و فراغت کیساتھ بسر ہوا پھر اس آرام اور پر سکون دن کو آپ اپنی زندگی سے کیوں خارج کر رہے ہیں؟ تو اس عظیم فرمانروا نے جواب دیا کہ جس

دن بادشاہ سے کسی مظلوم کوراحت نہ پہنچے، کسی محروم کی حاجت پوری نہ ہومیرے نزدیک وہ بیکار دن عزیز زندگی میں شمار کرنے کے بھی قابل نہیں۔ کسی شاعر نے فارسی میں اس مضمون کو یوں ظاہر کیا، ۔

عمر آں قدر پیش ما بدبکار   کہ در نفع خلق خدا بگذرد
دراں زندگانی چہ حاصل بود   کہ درکار نفس وہوا بگذرد

ہمدردی اور حاجت روائی کا وہ زریں اصول جسے اپنا کر بڑے بڑے سلاطین وقت نے اپنی سلطنت کو عروج اور ارتقاء بخشا ہمارے مذہب نے بھی اسی کو اپنانے کا ہمیں حکم دیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اسکے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کردیا کہ اگر تم کسی کی سفارش کر کے اسکی مدد کرو گے تو تمہیں بھی ثواب ملیگا (صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین وباب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنہ) یعنی کسی دردمند اور حاجتمند کی مالی یا بدنی علمی ، اخلاقی ، انفرادی یا اجتماعی مدد کر کے ثواب حاصل کرنا تو بڑی بات ہے اگر صرف ہونٹ یا قلم ہلا کر کسی کی سفارش میں دو بول بولکر یا لکھ کر کسی کی مدد کریگا تو بارگاہ خداوندی میں وہ بھی مقبول ومحمود اور لائق اجر وفضیلت بن جائیگا۔

بھیک مانگنے کی مذمت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب انصاری حضور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے کسی چیز کا سوال کیا آپنے فرمایا یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں؟ اہوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا ہوں اور کچھ حصہ بچھالیتا ہوں اور ایک پانی کا پیالہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا اچھا یہی دونوں چیزیں ہمارے پاس لے آؤ، جب وہ اپنا بوسیدہ اور پھٹا پرانا بچھونا اور ایک شکستہ پیالہ لے کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام جو اس وقت موجود تھے ان سکو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ان چیزوں کو فروخت کرتا ہوں تم میں سے کون ان کو خریدے گا؟ ایک صحابی اٹھے اور انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ میں اس کو دو درہم میں خریدتا ہوں، آپ نے پھر صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا کوئی شخص دو درہم سے زیادہ اسکے دام لگائے گا! یہ سن کر اور ایک صحابی کھڑے ہوئے اور انہوں نے دو درہم سے زیادہ اس کے دام لگا دیئے۔

اس پر آپ نے یہ چیزیں ان کو فروخت کر دیں اور ان سے جو رقم حاصل ہوئی وہ اس انصاری کو دے دی اور فرمایا کہ اس میں سے ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے دو اور باقی پیسوں سے رسی خرید کر لاؤ اور جنگل سے لکڑیاں اس سے باندھ کر لایا کرو اور شہر میں لا کر ان کو بیچ دیا کرو۔ یہ انصاری صحابی حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل شروع کردیتے ہیں اور پندرہ دن کے بعد جب دوبارہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے ہیں تو اس حال میں ہوتے ہیں کہ ان کے پاس پندرہ درہم کی کثیر رقم ہوتی ہے جس سے وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے کچھ کپڑے اور غلہ خریدتے ہیں ان کی اس خوشحالی کو دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بتاؤ یہ اچھا ہے؟ یا یہ اچھا تھا کہ کل قیامت کے دن تم اس طرح اٹھتے کہ تمہارے چہرے پر گدائی کا بدنما داغ لگا ہوا ہوتا (سنن ابی داؤد کتاب الزکوۃ باب ما تجوز فیہ المسئلۃ)۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوگیا کہ ''گداگری'' اور سوال کرنا اسلام کی نگاہ میں اسقدر قبیح اور گھناؤنا فعل ہے کہ مجبوری اور فاقہ کی حالت میں بھی اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ وہ انصاری غریب صحابی جن کے پاس نہ کھانے کو تھا نہ پہننے کو نہ اوڑھنے کو تھا نہ بچھونے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی سوال کرنے اور مانگنے کی اجازت نہ دی بلکہ ان کو کام پر لگا کے امت مسلمہ کو یہ سبق دے دیا کہ جب تک جسم میں طاقت اور رگوں میں خون ہے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے بلکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالے۔

دانائے سبل اور ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے گدائی اور بھیک مانگنے سے جو اس قدر امت مسلمہ کو روکا حتی کہ بعض مقامات پر یہ تک فرمادیا کہ جو شخص مانگ کر حاصل کریگا اور سوال کر کے کھائیگا وہ حرام کھائیگا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الزکوۃ

باب ما تجوز فیہ المسئلۃ) تو گداگری کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سخت اور شدید رد یہ کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مذہب اسلام میں عزت نفس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسلام یہ کبھی گوارہ نہیں کرسکتا کہ کوئی مسلمان ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرے یہی وجہ ہے کہ ہم کو صرف ایک ذات برحق کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا اور دوسرے تمام سجدوں سے منع کردیا کہ مٹی کی مورتیوں، پتھروں کے مجسموں یا شمس وقمر اور گائے بیلوں کے آگے سر کو جھکانے میں ہماری عزت نفس مجروح نہ ہو جائے۔

اور صاف فرمادیا کہ "**لیس للمؤمن ان یذل نفسه**" (مجمع الزوائد ص۲۷۲ ج ۷، جامع مسانید ابوحنیفہ ۱۲۵) کہ کسی مؤمن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرے اسی طرح اگر ہم اسلام کے دیگر احکامات پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ہمیں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا، مثلاً فحاشی، عریانی، زناکاری، شراب نوشی، جوا اور سٹہ بازی اور ان جیسے دیگر منہیات کے حرام ہونے میں یہی حکمت اور مصلحت ہے کہ یہ چیزیں انسان کی عزت نفس اور اس کی خودداری کو ختم کردیتی ہیں لہذا اسلام میں اسکو حرام کردیا گیا۔

الغرض اسلام میں عزت نفس اور خودداری کا بڑا مقام ہے اور یہ عزت نفس اور خودداری گداگری اور بھیک مانگنے میں پاش پاش ہو جاتی ہے انسان کی حمیت اور غیرت کے تمام شیشے چکنا چور ہو جاتے ہیں وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، ہزار لوگوں کے طعنے سنتا ہے، سینکڑوں کی جھڑکیاں سہتا ہے، گھروں سے دھکے دیکر باہر نکالا جاتا ہے، پھر بھلا ایسی صورت اور حالت میں اسکی عزت نفس کہاں برقرار

رہ سکتی ہے اسی لئے بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے فعل کی شدت کے ساتھ ممانعت فرمادی جوانسان کی عزت اور حرمت کو پائمال کر دے۔ اور سوال کرنے کو حرام قرار دیکر مجبوری کی حالت میں بھی اس سے منع کر دیا تا کہ کہیں مسلمان کی "عزت" کا آ بگینہ ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔

اب ذرا وہ لوگ غور کریں جو تندرست اور صحت مند ہوتے ہوئے، مال و دولت ہونے کے باوجود بھی بھیک مانگتے ہیں وہ اسلام کی نظر میں کتنے سخت جرم کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اسکے علاوہ سوال کی ممانعت میں اقتصادی اور معاشی خوشحالی کا راز بھی مضمر ہے اس لئے کہ اگر لوگ بیکار اور بے مقصد بھیک مانگتے رہیں گے تو وہ ملک اور معاشرے پر ایک بوجھ بن جائیں گے۔ لیکن اگر وہ کسی کام میں لگ جائیں گے مزدوری یا کوئی اور پیشہ تجارت وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پالیں گے تو نہ صرف کہ وہ خوشحال ہونگے بلکہ اس سے ملک خوشحال ہو جائیگا اسلئے کہ ملک کے کاروبار، تجارت، صنعت و حرفت میں ترقی ہوگی اور اسطرح ملک و ملت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

وصیت کے احکام

وراثت کے احکامات اور وارثوں کے مقررہ حصوں کے بیان سے قبل قرآن نے تقسیم دولت کیلئے وصیت کو ہر مسلمان کیلئے لازمی اور فرض قرار دیا۔لیکن ناگہانی موت کی صورت میں وصیت نہ کئے جانے کے باعث بڑی مشکلات پیش آجاتی تھیں مثلاً رشتہ داروں میں جو بھی زورآور ہوتا تھا وہ ہی مرنے والے کے تمام مال پر قابض ہوجاتا تھا لہٰذا وصیت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوا اور آیہ کریمہ نازل ہوئی "**یوصیکم الله فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین**" ان متعدد آیات میں وارثوں کے من جانب اللہ حصے مقرر کردیئے گئے لیکن وصیت کو پھر بھی جائز رکھا گیا۔اسلئے کہ اکثر مرنے والے کے بعض متعلقین ایسے ہوتے ہیں جو اسکے اپنے رشتہ داروں اور وارثوں سے زیادہ اسکے خدمت گزار اور اسکے محسن ہوتے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری دولت سے انکو بھی کچھ حصہ ملے تاکہ اس طرح انکا کچھ حق خدمت بھی اداء ہوجائے اور انکے احسانات کا کچھ انکو بدلہ بھی مل جائے۔اسلئے شریعت نے وصیت کو تہائی مال میں جائز رکھا تاکہ وہ اپنی مرضی سے ان اپنے دوستوں اور محسنوں کو بھی اپنے مال میں سے حصہ دے سکے، جن کو رشتہ داری کی بناء پر شرعی طور سے حصہ نہیں مل سکے۔

اس کے علاوہ وصیت کے جائز رکھنے کی ایک حکمت اور مصلحت یہ بھی ہے کہ انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسکے مرنے کے بعد اسکا پیسہ کسی نیک دینی اور فلاحی کام میں لگ جائے تاکہ جب تک وہ نیک کام دنیا میں ہوتا رہے ہمیشہ ہمیشہ اسکا ثواب اسکو ملتا رہے اور اسکی آخرت سنور جائے لہٰذا اس نیک خواہش کی تکمیل کیلئے شریعت نے اسکو اسکے مال میں وصیت کی اجازت دی لیکن اس صورت میں دوسرے ورثاء کی حق تلفی

نہ ہونے پائے اسکے لئے شریعت نے دوقیدیں لگادیں پہلی تو یہ جسکے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ "ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث" (مشکوٰہ بحوالہ ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ ۲۶۷) اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اسکا حق اور اسکا حصہ عطاء فرمادیا یعنی رشتہ داروں کے حصہ مقرر فرمادیے لہٰذا اب وصیت نہیں کی جائیگی کیونکہ جب انکے حق اور استحقاق کے مطابق شریعت نے انکا حصہ انکو دے دیا تو پھر انہیں میں سے بعض کیلئے وصیت کے ذریعہ مزید مال دیکر دوسروں کی حق تلفی کرنے سے کیا فائدہ۔

لہٰذا شرعی وارثوں کیلئے وصیت نہ ہوگی اور دوسرا اصول یہ ہے کہ شرعی وارثوں کی حق تلفی بھی نہ ہونے پائے یعنی مرنے والے کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا تمام کا تمام مال راہ خدا میں یا کسی اور اپنے دوست اور عزیز کو وصیت میں دے جائے، اسکے لئے شریعت نے تہائی مال کی حد مقرر فرمادی کہ اس سے زیادہ میں وصیت جاری نہیں ہوسکتی چنانچہ حضرت سعد بن وقاص فرماتے ہیں کہ میں بیمار ہوا نبی رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے اور مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اپنے مال کی وصیت کردی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں آپ نے فرمایا کتنے مال کی وصیت کی ہے؟ عرض کیا کہ اپنا تمام مال میں نے راہ خدا میں دینے کی وصیت کی ہے آپ نے فرمایا کہ تم نے اپنی اولاد کیلئے کیا چھوڑا انہوں نے عرض کیا حضور وہ تو خود دولت منداور غنی ہیں انہیں کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ فرماتے ہیں تو میں ان کیلئے اپنے مال میں سے دسویں حصے کی وصیت کردیتا ہوں جب آپ نے انکار فرمایا تو انہوں نے آخر میں عرض کیا کہ پھر میں تہائی مال کی وصیت کردوں آپ نے فرمایا ہاں ان کے لئے بہت رہیگا۔ (صحیح بخاری جلد اول کتاب الوصایا)

عدل وانصاف

مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ ''ابوحدرد'' اسلمی رضی اللہ تعالی عنہ ایک مفلوک الحال صحابی تھے جنکی غربت کا یہ عالم تھا کہ سوائے بدن کے کپڑوں کے ان کے پاس اور کچھ نہ تھا، انہوں نے ایک یہودی سے کچھ قرضہ لیا ہوا تھا، ایک روز یہودی اپنا قرضہ لینے کے لئے ان کے پاس آیا اور اپنے پیسے طلب کئے، آپ کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا جس سے اس کا قرض اتارتے لہذا دو تین روز کی اس سے مہلت مانگی لیکن وہ یہودی دو تین روز کی مہلت دینے پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔

آخر یہ معاملہ حضور کی بارگاہ عدل و انصاف میں پیش ہوا، آپ نے حضرت اسلمی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اس کا قرض ادا کرو، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں سوائے تن کے کپڑوں کے، غزوۂ خیبر قریب ہے شاید وہاں سے واپسی پر کچھ مال غنیمت ملے تو میں اس سے اس کا قرض ادا کردوں گا، آپ نے انکے اس عذر کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ نہیں بلکہ اس کا قرض ابھی ادا کرو، راوی کا بیان ہے کہ جب بارگاہ نبوت سے ان کے خلاف یہ فیصلہ ہوگیا تو اس فیصلے پر حضرت اسلمی نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنا تہبند اتار کر اس یہودی کو فوراً قرض میں دے دیا، اور سر سے اپنا عمامہ کھول کر اپنی کمر سے لپیٹ لیا۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۲۲۳ معجم صغیر طبرانی)۔

یہ ہے وہ بارگاہ مصطفیٰ کا عدل وانصاف جس نے دشمنوں کو بھی اسلام اور بانئ اسلام کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اگر آنحضرت چاہتے تو اس یہودی سے دو چار دن

کی مہلت کے لئے فرما سکتے تھے اور آپ کی یہ سفارش بے جا بھی نہ ہوتی اس لئے کہ اس وقت حضرت اسلمی کے پاس کچھ نہ تھا جس سے وہ اس کا قرض اتارتے، لیکن اپنے محبوب صحابی کی کوئی رعایت نہ کی اور اس کے لئے چند دن کی مہلت بھی طلب نہ کی تا کہ آنے والا مؤرخ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ ''عدل وانصاف'' کے اس علمبردار نے اس فیصلے میں بیگانوں کے مقابلے میں اپنوں کا پاس رکھا ہے اور ان کی رعایت کی ہے، بلکہ تن کے کپڑے ایک یہودی کے قرض میں اتروا کر تاریخ میں عدل کی ایک مثال قائم کردی۔

ذرا غور کریں وہ لوگ جو اپنے دوستوں اور بھائیوں کے قرض لئے بیٹھے ہیں اور استطاعت و ہمت کے باوجود ان کے قرض ادا نہیں کرتے، عدل مصطفیٰ کا تو یہ تقاضا ہے کہ اگر گھر میں کچھ بھی نہ ہو تو تن کے کپڑے اتار کر قرض دار کا قرضہ ادا کیا جائے نہ کہ یہ کہ سب کچھ ہوتے ہوئے اس کا قرضہ نہ ادا کیا جائے اور اس کو خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ اسلامی نظام میں ''عدل'' کا لفظ ایک ہمہ گیر وسعت کا حامل ہے۔ اس کا مفہوم صرف عدالتی نظام میں انصاف کے قائم کرنے تک محدود نہیں بلکہ معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے امور میں انصاف اور اعتدال پیدا کرنے میں مستعمل ہے۔

چنانچہ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر زندگی کے مختلف مگر اہم شعبوں میں عدل و انصاف کا حکم دیا، مثلاً معاشرتی زندگی میں سب سے زیادہ عدل و انصاف کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد بیویوں کے شوہر ہیں لہذا ایسے لوگوں کو سورۃ النساء میں حکم دیا جاتا ہے کہ ''اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو

کہ تم کئی بیویوں میں عدل و انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی سے شادی کرو" اسی طرح معاشرے میں یتیموں کا مسئلہ بھی بڑا نازک ہے، اکثر یتیموں کا خیال نہیں رکھا جاتا، ان کے ساتھ بے پرواہی اور بے اعتنائی برتی جاتی ہے لہذا یتیموں کے متعلق بھی اسی سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے کہ "یتیموں کے حق میں انصاف ملحوظ رکھو" اسی طرح معاشی اور اقتصادی نظام میں سب سے اہم چیز خرید و فروخت اور لین دین ہے جس سے ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے، کون ایسا شخص ہے جو اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بازار جاکر لین دین اور خرید و فروخت میں مصروف نہیں ہوتا اب اگر لین دین کے معاملے میں عدل و انصاف ختم ہوجائے اور ناپ تول میں کمی کی جانے لگے تو اس کا نقصان صرف ایک یا دو اشخاص تک محدود نہیں رہے گا بلکہ پوری قوم اس نقصان سے دوچار ہوگی، استحصال بڑھتا چلا جائے گا اور معاشی ناہمواری پوری انسانیت کو اپنے شکنجے میں جکڑ لے گی، لہذا اس عظیم نقصان سے انسانیت کو بچانے کے لئے قرآن نے وزن اور پیمانہ میں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا اور سورۃ انعام میں حکم ہوا کہ انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ کرو اور پورا پورا تولو۔

عدالتی معاملات میں "عدل و انصاف" کے متعلق قرآن و حدیث نے مختلف امور کا ذکر فرمایا جس میں سب سے اہم "عدل" کا ایک یہ زریں اصول بیان فرمایا" **واذاقلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی** "کہ اگر گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا ہو جب بھی کوئی بات کہو تو ہمیشہ انصاف کی بات کہنا اور عدل سے کام لینا اگرچہ تمہارا قربت دار ہی کیوں نہ ہو یعنی رشتہ داری کو دیکھتے ہوئے فیصلہ نہ کرنا بلکہ

جو حق ہو وہ کہنا۔ اسی طرح اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جو دولت مند اور عزت والے ہوتے تھے ان کے ساتھ فیصلہ کرتے وقت رعایت برتی جاتی تھی اور عام لوگوں کے ساتھ سختی برتی جاتی تھی، لیکن اسلام نے اس تفریق کو ختم کر دیا اور اعلان کر دیا کہ خدا کے قانون کی نظر میں سب برابر ہیں خواہ وہ امیر ہو یا کبیر، وزیر ہو یا سفیر، جو جرم کرے گا سب کو یکساں سزا ملے گی۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی غریب چوری کر لے تو اس کے تو ہاتھ کاٹ دیئے جائیں لیکن اگر کوئی امیر و کبیر، یا سفیر و وزیر چوری کریں بلکہ ڈاکہ ڈالتے پھریں تو ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو، یہ ہیں اسلامی نظام کی خصوصیات جنکو چھوڑ کر ہم اس نظام کی برکات اور فوائد سے کبھی مستفید نہیں ہو سکتے۔

یتیم کی پرورش

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں اور کسی یتیم بچے کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے۔ (صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیما، صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم) دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد والا کا مقصد لوگوں کو یتیموں کی نگہداشت اور ان کی کفالت کی طرف ترغیب دلانا تھا کیونکہ یتیم ایک ایسی مظلوم اور معصوم ذات ہے جس پر ہر دور میں ظلم ہوتا رہا اور کسی مذہب نے ہمدردی و غمگساری، امداد و پرورش کے بارے میں ان کو وہ حق نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے، جب ہم تورات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں عشر اور زکوۃ کے مستحقین کی فہرست میں صرف دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام نظر آتا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی حکم ان کے متعلق نہیں ملتا، جب انجیل پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بیچاری مظلوم ذات کا ہمیں سرسری ساذکر بھی نظر نہیں آتا اور جب قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت کی تاریخ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو یتیم کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن اس کے متعلق ایک ایسی دردناک داستان ملتی ہے جس کو پڑھ کر ایک دردمند انسان کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہے۔

قرآن ان کے اس بہیمانہ سلوک کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ "فذالك الذی یدع الیتیم" یہ وہ لوگ ہیں جو یتیم کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے ہیں۔ یتیم کے بارے میں انہی عرب کے وحشیوں کی ایک اور سفاکانہ طرز کو

قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ "وتـاكلون التراث اكلا لا" یعنی یہ لوگ یتیموں کے جوان ہونے کے ڈر سے ان کے باپوں کا مال اور جائداد جلدی جلدی کھا پی کر ہضم کر جایا کرتے تھے تا کہ یہ بڑے ہوکر اپنے مال کہیں طلب نہ کر بیٹھیں، الغرض باپ کے سائے سے محروم ان بچوں پر جب ظلم کی انتہا ہوگئی، جب یہ دنیا اپنی وسعت کے باوجود ان کے چھوٹے سے وجود کے لئے تنگ پڑ گئی تو اس رب العالمین نے آمنہ کے لال، عبد اللہ کے در یتیم کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا جس نے ان مظلوم بچوں کو اپنے سینے سے لگایا، ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو اپنی پیار بھری باتوں سے جوڑا، ان کے زخموں کو اپنی تعلیمات سے مندمل کیا، اور یہ اعلان فرما کر کہ "قیامت کے دن میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے، لوگوں کو یتیموں کے حقوق سے اور مقام سے نہ صرف آشنا کر دیا بلکہ یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی کفالت کرنے کا شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کے لئے وقتاً فوقتاً مزید احکامات سے روشناس کرایا جاتا رہا، چنانچہ سورۃ نساء کی متعدد آیات میں سب سے پہلے ان یتیموں کو وراثت کا حق دلایا گیا ہے جس کو شقی القلب وحشیوں نے ختم کر دیا تھا، اس کے بعد جو جاہلیت کے زمانہ میں یتیموں کی کفالت کا ذمہ لیکر ان کا تمام پیسہ ہضم کر جایا کرتے تھے ان کے لئے حکم ہوتا ہے کہ یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو، ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے نہ بدلو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھاؤ کہ بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔

اس کے علاوہ اسی سورۃ النساء میں ان کے متعلق مزید ہدایات یہ کی جاتی ہیں کہ ان کے مال کو اسراف سے خرچ نہ کرو اور جب تک ان کو پورا شعور نہ آ جائے اس وقت تک ان کی رقم ان کے حوالے نہ کرو کیونکہ اگر ان کا مال بچپن میں ان کے حوالے کر دیا تو ابھی ناسمجھ ہیں سب کچھ لٹا کے بیٹھ جائیں گے لہٰذا ان کو جانچتے رہو، جب یہ سمجھ لو کہ اب ان کی عقل پختہ ہوگئی ہے تو پھر ان کی امانت ان کے سپرد کر دو اور ان کے بڑے ہونے تک ان کے اس مال اور ان کی اس امانت کو کس طرح رکھو اس کے لئے قرآن کہتا ہے کہ "**ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن**" یعنی یتیم کے مال کی ایسی نگہداشت کرو کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، ہاں اگر اس ہی کی بھلائی کے لئے استعمال کرو تو کر سکتے ہو ورنہ بری نیت سے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔

الغرض قرآن و حدیث کی ان تعلیمات نے یتیموں کے متعلق وہ شفقت اور محبت کے جذبات لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دئے کہ اب ہر شخص یتیموں کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا، پھر تو تعلیمات مصطفیٰ نے فضا کو ایسا بدلا کہ وہ ہی وحشی جو یتیموں کو دھکے دیکر باہر نکال دیا کرتے تھے اب وہ ہی شفقت و محبت سے اپنے گھروں میں یتیموں کی پرورش کرنے لگے، حضور کی ترغیب دلانے کا یہ اثر ہوا کہ ایک ایک یتیم کے لئے کئی کئی رحمت و شفقت کے ہاتھ بڑھنے لگے، ہر ایک اصرار کرتا تھا کہ اس یتیم کو میرے سپرد کر دیجئے تا کہ اس نیکی کو حاصل کر کے خدا کا مقرب بن جاؤں۔

تاریخ میں آتا ہے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا تھا،

جہاں ہر ایک صحابی کسی نہ کسی یتیم کی بڑی محبت وشفقت کے ساتھ پرورش کررہا تھا اور اس پر فخر محسوس کرتا تھا۔ (صحیح بخاری باب عمدۃ القضاء) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا تو یہ حال تھا کہ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے کہ جب تک ان کے دسترخوان پر ان کے ساتھ کوئی یتیم بچہ نہ ہوتا تھا۔ (ادب المفرد لامام بخاری باب فضل من یعول یتیما) خود رسول کے گھرانے سے ایک معزز خاتون ام المؤمنین حضور کی لاڈلی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یتیموں کے متعلق حضور کی تعلیمات پر عمل کرکے دکھایا اور اپنے خاندان کے علاوہ انصار کی یتیم لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کی بڑی محبت اور شفقت سے پرورش کرکے تاریخ عالم میں ایک مثال قائم فرمائی۔ (مؤطا امام مالک کتاب الزکوۃ/سند احمد ج٦ ص ٢٦٩/تذکرۃ الحفاظ لذھبی ج٦ ص٣٢)

تجارت میں جھوٹی قسمیں کھانا

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں نہ ان کو پاک کریگا اس دن ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور سے عرض کیا کہ، یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم اس قدر ناکام اور ٹوٹے میں رہنے والے ایسے کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک وہ شخص ہے جو تکبر کی وجہ سے اپنے کپڑے نیچے لٹکائیگا، دوسراوہ شخص ہے جو کسی پر احسان کر کے اس کو جتاتا پھریگا اور تیسرا وہ شخص ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچے گا، (سنن ابوداؤد، کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار، ترمذی، ابن ماجہ، سنن نسائی) اس حدیث سے یہ پتا چلا کہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے مال کوفروخت کرنا سخت گناہ ہے، اور کیوں نہ ہو اسلئے کہ صرف جھوٹ بولنا ہی اسلام میں ایک گھناؤنا فعل شمار کیا جاتا ہے بلکہ تمام برائیوں کی جڑ مانا جاتا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ" ان اللہ لایھدی من ھوکاذب کفار" کہ جو شخص جھوٹا اور احسان فراموش ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسکوراہ ہدایت نہیں دکھاتا تمام نیکیوں کے دروازے اس کیلئے بند ہو جاتے ہیں۔

اور برائیوں اور شروں کے راہ اس کے لئے کھل جاتے ہیں حتی کہ کفر تک وہ پہنچ جاتا ہے چنانچہ جب حضور سے پوچھا گیا کہ دوزخ میں پہنچانے والا کام کونسا ہے تو آپ نے فرمایا کہ جھوٹ بولنا ہے کہ جب انسان جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام

کریگا جب گناہ کے کام کریگا تو کفر کریگا اور جب کفر کریگا تو دوزخ میں چلا جائیگا (مسند احمد جلد ۱، ص ۱۷۶) یہی وجہ ہے کہ لعنت بھیجنا جو کافروں اور مشرکوں کیلئے ہوتا ہے وہ اگر مسلمانوں میں کسی پر روا ہے تو وہ جھوٹ بولنے والے پر ہے، خود قرآن کا ارشاد ہے کہ "فنجعل لعنت اللہ علی الکاذبین" تو اب ذرا غور فرمائیے کہ جب کسی عام شخص سے جھوٹ بولنا اتنا سخت جرم ہے اور اسکی اتنی قباحتیں ہیں تو پھر جھوٹی قسمیں کھانا کس قدر ہیبت ناک جرم ہوگا اور اسکے کتنے ضرر رساں اثرات ہوں گے اسلئے کہ کسی چیز پر قسم کھانا درحقیقت اس بات کی صداقت اور سچائی پر خدا کو گواہ بنانا ہوتا ہے اول تو کسی دنیوی بات پر اور لین دین کے معاملات پر سچی قسم بھی نہیں کھانی چاہئے اسلئے کہ اس حقیر اور ذلیل دنیا کا اتنا مرتبہ نہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کے نام سے اسکی ترویج و اشاعت کی جائے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ خرابی ہے سوداگر کیلئے ان کلمات کے کہنے میں کہ بلٰی، واللہ، لا واللہ، تو جب ایک مسلمان کیلئے تجارت اور دیگر دنیوی معاملات میں سچی قسم کھانا بھی روا نہیں تو پھر جھوٹی قسم کھانا اور جھوٹی بات پر خدا کو گواہ بنانا کس قدر الم ناک اور لرزہ خیز جرم ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں ایسی جھوٹی قسموں کی بہت برائیاں آئی ہیں حتی کہ ایک مقام پر سرور کائنات روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی قسم کا شمار شرک اور قتل جیسے عظیم گناہوں کیساتھ کیا (جامع ترمذی، ابواب البرّ والصلۃ، باب ماجاء فی حقوق الوالدین) اور ایک مقام پر یہاں تک فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہیگا تو اللہ تعالیٰ اسپر دوزخ کی آگ کو واجب کردیگا (صحیح مسلم، کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین) اور پھر

جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے مال کو بیچنے والے تاجروں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ ان جھوٹی قسموں سے انکو دنیا کا بھی کوئی خاص نفع حاصل نہیں ہوسکے گا بلکہ نقصان ہی ہوگا، کیونکہ اس صادق اور امین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کبھی غلط نہیں ہوسکتا اور آپ نے یہ فرمادیا ہے کہ ''**فانہ ینفق ثم یمحق**" (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداوٗد کتاب البیوع باب فی کراھیۃ الیمین فی البیع)۔'' کہ جھوٹی قسمیں مال کو بکوا تو دیں گی مگر نفع یعنی برکت کو گھٹا دیں گی'' روحانی طور پر اس کے مال سے جو برکت ختم ہوگی اور ہمیشہ کی فراوانی کے باوجود اسکو جو تنگی آئیگی وہ تو ہے ہی چنانچہ بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ نہ معلوم کیا بات ہے اسقدر ہم کماتے ہیں لیکن وہ یکدم ختم ہوجاتا ہے، نہ معلوم اتنا پیسہ کہاں چلا جاتا ہے ہماری ضرورتیں توجوں کی توں رہ جاتی ہیں اور پیسہ سب کا سب غائب ہوجاتا ہے ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے کاروبار اور اپنے پیسے میں غور کریں کہ اسمیں وہ کہاں کہاں بے ایمانی کرتے ہیں اور کہاں کہاں خدا کی نافرمانی سے پیسے حاصل کرتے ہیں اگر کہیں کوئی اس قسم کا معاملہ نظر آئے تو وہ اس کو خود ختم کردیں پھر دیکھیں کہ اگرچہ وہ تھوڑے پیسے ہی کیوں نہ ہوں اللہ تعالیٰ اسمیں بھی اتنی برکت دے دیگا کہ اس حقیر اور چھوٹی سی رقم میں ہی اسکی تمام جائز ضرورتیں پوری ہوتی چلی جائیں گی، اور وہ مختصر سے پیسے اسکے حرام کے ہزاروں روپوں پر بھاری ہوجائیں گے اس کے علاوہ ظاہری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا اس طرح ظہور ہوگا کہ اس پر سے اعتماد اور اعتبار اٹھتا چلا جائیگا آخر لوگ اس کی بے ایمانی کے باعث اس سے لین دین کم کردیں گے یہاں تک کہ اسکی حالت بدتر سے بدتر ہوتی چلی جائیگی۔

حلال کمائی

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو جسم حرام غذا سے پرورش پائیگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا“ (مشکوۃ بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان کتاب البیوع باب الکسب وطعم الحلال) اس حدیث مبارکہ میں ”رزق حلال“ کے حصول کی جو تاکیدیں کی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکیزہ اور حلال رزق، نفس انسانی کے ارتقاء اور اس کے روحانی ارتقاء اور اس کے روحانی اطمینان وسکون اور ترقیات کا سبب بنتا ہے، آج اس ترقی یافتہ دور میں ہر شخص جسمانی صفائی اور ظاہری نمود ونمائش و چہرہ مہرہ اور لباس و بدن کو تو پاک وصاف رکھنے میں ہر وقت مصروف رہتا ہے لیکن افسوس روحانی، پاکیزگی اور باطنی طہارت وصفائی کا کوئی خیال نہیں رکھتا، حالانکہ اسلام نے ظاہری پاکیزگی کے ساتھ ساتھ روحانی اور نفسانی پاکیزگی پر بھی بہت زور دیا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں "**یاایھا الناس کلوامما فی الارض حلالا طیبا**" فرما کر ظاہری پاکیزگی کے ساتھ حلال کے لفظ سے باطنی پاکیزگی کا بھی ذکر فرمایا یعنی اپنے ایمان والوں کو یہ ہدایت کردی کہ جو تم رزق کھاؤ وہ ظاہری طور پر بھی ظاہری گندگی اور خرابیوں سے پاک ہونا چاہیے تاکہ تمہاری جسمانی صحت پر برا اثر نہ پڑے اور تمہارا جسم صحیح نشو ونما پاسکے، اسی طرح وہ تمہارا رزق باطنی نجاستوں اور گندگیوں سے بھی پاک ہونا چاہیئے، وہ تمہارا رزق چوری، ڈاکہ، زنی، رشوت، جوے یا سود وغیرہ سے حاصل کیا ہوا نہیں ہونا چاہیئے یا دیگر اسلام کی حرام کی ہوئی اشیاء مثلا شراب، افیون، بھنگ، مردار یا حرام جانوروں پر

مشتمل نہیں ہونا چاہئے تا کہ تمہاری جسمانی صحت اور باطنی صفائی متاثر نہ ہونے پائے اور تمہارا ضمیر مردہ نہ ہو جائے، اس لئے کہ معاشرہ کی تمام برائیوں کی جڑ اصل اسی انسانی ضمیر اور دل کا مردہ ہونا ہے اگر یہ مردہ ہو گیا تو پھر اس قوم کو فحاشی، عریانی، ظلم رسانی، رشوت ستانی الغرض کسی بھی بڑے سے بڑے جرم سے اسے کوئی نہیں روک سکے گا اور وہ قوم تنزلی اور ابتری کا شکار ہوتی چلی جائیگی، اسی لئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:

دلِ مردہ دل نہیں اسے زندہ کرو دوبارہ

کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

اس کے علاوہ حلال اور جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت معاشرہ کے لئے بھی آسودگی، اطمینان اور راحت کا سبب بنتی ہے اور خود اس کے کمانے والے کے لئے بھی، اسلئے کہ ناجائز معاشی استحصال کے باعث غریبوں کے خون پسینے کی کمائی ہوئی تمام دولت سمٹ کر جب چند ہاتھوں میں آجاتی ہے تو غریبوں کے انتقام کی آگ ان دولتمندوں کے عشرت کدوں کو ایک نہ ایک دن جلا کر خاکستر کر دیتی ہے تاریخ شاہد ہے کہ کتنے ہی ملک اسی معاشی زبوں حالی کے سبب سرخ انقلاب کی آماجگاہ بن گئے، اور اسی کے باعث کتنی حکومتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں اس کے برخلاف حلال ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کے سبب نہ کمانے والا کسی غریب کی انتقامی کاروائی کا شکار ہوتا ہے نہ اسے کسی قانونی گرفت اور سزا کا خوف ہوتا ہے نہ وہ اس جہاں اور اس جہاں میں جواب دہی کے ڈر سے ہر وقت پریشان حال رہتا ہے اور نہ معاشرہ میں کوئی بے چینی پیدا ہوتی ہے بلکہ ہر شخص آسودہ حال آرام کی زندگی بسر کرتا ہے۔

کسب حلال

مذہب اسلام انسان کو مال و دولت کمانے سے نہیں روکتا بلکہ وہ تو اسکو نکما بیٹھ کر صرف روٹی توڑتے رہنے سے منع کرتا ہے اور روزی کمانے کو اسکے لئے فرض قرار دیتا ہے لیکن وہ اسکے ساتھ شرط ضرور لگاتا ہے کہ وہ روزی حلال، جائز اور شریعت کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کمائی جائے چنانچہ آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "**طلب کسب حلال فریضۃ بعد الفریضۃ**" (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان) فرضوں کے بعد ایک فرض حلال روزی کمانا ہے یہاں حلال کی قید اسلئے لگائی گئی کہ حلال طریقوں اور جائز راستوں سے حاصل کیا ہوا رزق ہی انسان کی دینی اور دنیوی ترقیات کا موجب اور سبب بنتا ہے اگر کسب حلال نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ہی کوٹھیوں ، بنگلوں، کاروں ،اور زمینوں کا مالک کیوں نہ ہو، کتنا ہی اسکا بینک بیلنس کیوں نہ ہو ایسا شخص نہ صرف یہ کہ آخرت کے فضائل و درجات کو کھو کر اپنے لئے جہنم کے دہکتے ہوئے انگارے تیار کر لیتا ہے بلکہ وہ دنیا میں اخلاقی گراوٹ اور رذائل کا بھی شکار ہو جاتا ہے کیونکہ یہ حرام رزق کی خصوصیت ہے کہ وہ جب جسم میں پہنچتا ہے تو وہ آدمی کے اسلامی اوصاف و فضائل اور انسانی احساسات وجذبات کو آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے جسکا واضح نتیجہ اخلاقی اور روحانی تنزلی کی صورت میں نکلتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نفرت دلاتے ہوئے فرمایا کہ حرام روزی سے بنے ہوئے خون کے لئے یہ زیادہ اچھا ہے کہ وہ

آگ میں جلا دیا جائے ۔دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا کہ: کوئی کپڑا اگر خریدا جائے اور اس میں ایک پیسہ بھی حرام کا ہوتو اس کپڑے کو پہن کر آدمی جب تک نماز پڑھیگا اسکی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔

اسکے برخلاف رزق حلال انسان میں عمدہ خصائص کے پیدا ہونے، روحانی اور ذہنی ارتقاء کا سبب بنتا ہے جسکی طرف اس حدیث مبارک میں یوں ارشاد فرمایا گیا کہ آدمی جب حلال روزی کماتا ہے تو اسکا قلب نور سے معمور ہوجاتا ہے اور حکمت وعقلمندی اس سے پھوٹنے لگتی ہے۔اسی طرح دعا کی قبولیت کہ جس پر انسان کی دینی اور دنیوی ترقیوں کا مدار ہے وہ بھی اسی رزق حلال پر موقوف ہے ذرا اس حدیث پر نظر ڈالئے جس میں حضرت سعد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے دعا فرمایئے کہ میں مستجاب الدعوات ہوجاؤں یعنی میں جو دعا کروں وہ اللہ کی بارگاہ میں فوراً قبول ہوجایا کرے اسپر آپ نے عظیم راز آشکارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کسب حلال اختیار کرو تمہاری دعائیں قبول ہوجائیں گی۔(الترغیب) بہرحال پتہ یہ چلا کہ حلال کی روزی تمام نیکیوں ،عمدہ خصائل،اور اعلیٰ فضیلتوں کے حصول کی کنجی ہے۔

اور اسکے برخلاف حرام کی کمائی تمام برائیوں ،بری عادتوں اور ہر قسم کی تنزلیوں کی جڑ اور اساس ہے یہی وجہ ہے کہ اس امت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیک لوگوں نے حرام رزق کے معاملہ میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ فرمایا اور وہ چیزیں جو واضح طور پر حرام تھیں مثلاً۔چوری یا ڈاکہ،کسی کا غصب شدہ مال یا سود

وغیرہ انکا تو لینے کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا، وہ امور جو حلال تھے لیکن ان میں کچھ تھوڑا سا شبہ بھی ہوتا تھا ان نیک بندوں نے اسکو بھی چھوڑ دیا ایسے تقوے کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ مال غنیمت میں بہت سی مشک آئی حضرت عمر نے اسکو گھر میں لاکر رکھ دیا تا کہ دوسرے دن اس کو فروخت کر کے اسکی رقم تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے دوسرے دن جب آپ گھر میں آئے تو آپ کو اپنی بیوی کی چادر میں سے مشک کی خوشبو آئی آپ کے استفسار پر انہوں نے جواب دیا کہ میں نے آپ کے کہنے پر مشک کو تولا تھا تو ہاتھوں میں کچھ مشک لگ گیا تھا وہ میں نے چادر پر لگا لیا تھا آپنے وہ چادر اتاری اور اسکو اتنا دھویا کہ اسکی خوشبو زائل ہوگئی حالانکہ یہ چیز معاف تھی لیکن ان کے تقوے نے اس کو بھی گوارہ نہیں کیا۔

ملاوٹ اور دھوکہ دہی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو غلہ بیچ رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ غلہ اچھا معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب گئے اور اس کو اپنے ہاتھ سے دیکھنے لگے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلہ کے اندر ہاتھ ڈالا تو آپ کو اپنے ہاتھ میں کچھ تری اور گیلا پن محسوس ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ بیچنے والے سے فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! یہ غلہ بارش کی وجہ سے کچھ گیلا ہوگیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم نے اس بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، پھر فرمایا کہ جو شخص دغا اور دھوکہ کریگا وہ ہم میں سے نہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غش فلیس منا) ملاوٹ اور دھوکہ کرنے والوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ ایک ایسی وعید ہے جو ایک مسلمان کو ان ناجائز اور حرام امور سے باز رکھنے کے لئے کافی ہے، اسلئے کہ ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑھ کر قابل فخر اور لائق عزت چیز یہ ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہے، اقوام عالم میں اس کی سرخروئی کی صرف ایک وجہ ہے کہ وہ دامن مصطفیٰ کے ساتھ وابستہ ہے اور فخر انبیاء کے گروہ میں اور ان کی جماعت میں شامل ہے، اس کے لئے یہ تصور بھی روح فرسا اور قیامت انگیز ہے کہ حضور اسکو اپنی جماعت سے نکال دیں اور یہ فرمادیں کہ یہ ہم میں سے نہیں لہذا وہ ایسے گندے اعمال اور برے افعال کی طرف کبھی جانے کا

سوچے گا بھی نہیں اسکی اپنے آقا سے جدائیگی ہو جائے اور اسکو حضور یہ فرما کر اپنے سے دور کر دیں کہ "یہ ہم میں سے نہیں" تو چونکہ "ملاوٹ اور دھوکہ دہی" بھی ایسے قبیح افعال ہیں کہ جن کے مرتکب افراد کو حضور فرماتے ہیں کہ یہ ہم میں سے نہیں، لہذا ایک سچا مومن اور حضور کا شیدائی ان امور کا ارتکاب کرنا تو درکنار ان کے متعلق سوچے گا بھی نہیں۔

علاوہ ازیں وہ شخص جو ملاوٹ، دھوکہ یا دیگر جرائم کا ارتکاب نہیں کرتا وہ حقیقت میں کامل مومن کہلانے کا مستحق ہے اسلئے کہ حضور نے کمال ایمان کی ایک نشانی اور علامت یہ بیان فرمائی کہ "مومن کامل اپنے بھائی کیلئے وہ ہی پسند کرے گا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الایمان ج ا ص ٦) یہ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جامع اصول بیان فرما دیا ہے جو تمام جرائم اور اخلاق رذیلہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے، اسلئے کہ ایسا کون شخص ہے جو اپنی ذات کے لئے اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کو پسند کریگا، کون ہے جو اپنے لئے پسند کریگا کہ کوئی شخص اسکو دھوکہ دے کون ہے جو اپنے لئے پسند کریگا کہ اسکو خراب مال نیگ لگا دیا جائے لہٰذا اگر وہ کامل مؤمن ہے اسکو چاہئے کہ وہ جو چیزیں اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ اپنے بھائی کیلئے بھی پسند نہ کرے اور انکو دھوکہ اور فریب سے محفوظ رکھ کر اپنے کمال ایمان کا ثبوت پیش کرے۔

ہمارے اسلاف کے تذکرے ایسے کامل الایمان لوگوں کے حالات سے جگمگا رہے ہیں جنہوں نے اپنے آقا و مولیٰ نبی رؤوف و رحیم کے ارشاد اور منشا پر کامل عمل کر کے دکھایا چنانچہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے متعلق لکھا ہے کہ انکی

ایک کپڑے کی دکان تھی جس میں انکا نوکر کپڑے فروخت کرتا تھا دکان میں ایک کپڑے کا تھان تھا جسمیں عیب تھا ان کے نوکر نے ایک گاہک کو عیب اور نقص دکھائے بغیر پوری قیمت پر وہ کپڑا فروخت کر دیا اگر اس مقام پر آج کا تاجر ہوتا تو وہ خوشی سے کھل اٹھتا لیکن حضرت امام اعظم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپکا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، آپ نے اپنے نوکر کو سخت سرزنش کی اور فرمایا کہ تم نے ایک مسلمان کو کیوں دھوکہ دیا اسکو عیب کے متعلق کیوں نہیں بتایا جاؤ یہ ساری رقم خیرات کر دو یہ ہے وہ کردار کی بلندی جس نے مسلمانوں کو ہمدوش ثریا کر دیا اسکے برخلاف آج ملاوٹ اور دھوکہ دہی کے باعث اسقدر اخلاقی پستی ہے کہ مسلمان قصر مذلت میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔

بے جا منافع خوری

بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت ہے کہ جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے ایسے شخص پر جو فروخت میں آسانی اور نرمی برتنے والا ہے (مشکوۃ بحوالہ صحیح بخاری باب المساہلۃ فی المعاملۃ) اس حدیث میں اشارہ ہے کہ کسی مال کی بے انتہا قیمت بڑھا کر اس پر بے جا اور بے تحاشہ منافعہ حاصل کر کے لوگوں کو مشکل میں مبتلا نہ کرو بلکہ ضرورت کے مطابق جائز منافع وصول کر کے مخلوق خدا پر آسانی کرو تو خدا تم پر آسانی کریگا اور تمہاری دینی اور دنیوی مشکلوں کو آسان کر کے اپنی ردائے رحمت میں تمکو ڈھانپ لیگا علاوہ ازیں اپنے مال پر جائز منافعہ حاصل کرنا کیوں نہ خدا کی رحمت اور رضا مندی اور خوشنودی کا باعث بنے اسلئے کہ یہ عبادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچالیتی ہے اسکے نفس کو بہت سے اخلاق رذیلہ سے نجات دلا دیتی ہے اور بہت سی عمدہ صفات سے اس کے نفس کو متصف کر دیتی ہے مثلاً: اگر ایک شخص ناجائز منافع خوری کرتا ہے تو وہ جھوٹ جیسی بری اور لائق ملامت اور قرآن کی رو سے قابل لعنت صفت کیساتھ ضرور متصف ہوگا اسلئے گاہک کو اس قابل فروخت چیز کی اصلی قیمت اگر صحیح بتادی جائے تو وہ اس اصلی قیمت کو دیکھتے ہوئے اتنا زیادہ منافع دینے پر کبھی راضی نہیں ہوگا لہٰذا لامحالہ جھوٹ اور کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے اسکو اصل قیمت غلط بتا کر اسکی تسلی کرنی ہوگی تو اسطرح وہ اپنے اس ناجائز منافعہ کے حصول میں دو برائیوں کو حاصل کر کے

کامیاب ہوگا۔

ایک جھوٹ اور دوسرا ایک مسلمان کودھوکہ اور فریب دینا، جبکہ دونوں ایسی صفت ہیں کہ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایک مسلمان کی یہ صفت ہی نہیں ہوسکتی اسکے علاوہ اگر گاہک کواسکی باتوں پر یقین نہ آیا تو اسکو یقین دلانے کیلئے اس کوجھوٹی قسمیں تک کھانی پڑیں گی جو اس سے بھی بدتر گناہ ہے اور خدا کے قہر وغضب کا موجب ہے ایسا گناہ کہ جسکے لئے ارشاد رسول ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص پر جوجھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے نظر بھی نہیں ڈالیگا، (صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ) اور پھر ایک برائی اسکو یہ بھی کرنی پڑیگی کہ منافع حاصل کرنے کیلئے اپنے مال کی بیجا تعریف میں لغوکلام بھی کرنا پڑیگا اسکی اچھائیوں کے جھوٹے سچے قصیدے بھی پڑھنے ہونگے۔

اگرچہ اس وقت اس کو اس اپنے طول طویل اور بے فائدہ کلام کا کچھ احساس نہیں لیکن کل قیامت کے دن جب حساب وکتاب کے وقت اسکو ایک ایک کلمہ اور ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہوگا تب اسکو اس برائی کا احساس ہوگا اور اس وقت اسکو پتہ چلے گا کہ اس نے اتنے لغو اور بے فائدہ باتیں کرکے اپنے لئے کتنی مصیبت مول لے لی ہے، اور یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جسکا ہر شخص کوسامنا کرنا ہے۔

قرآن اسپر شاہد ہے ”وما یلفظ من قول الالدیہ رقیب عتید“ الغرض ناجائز منافعہ خوری نہ ایک ایسی برائی ہے جسکی وجہ سے انسان سے

دوسری برائیاں اور دیگر جرائم خودبخود بھی سرزد ہوتے ہیں اور اسکے برخلاف اگر آدمی جائز نفع حاصل کرے تو نہ صرف یہ کہ وہ بہت سی برائیوں سے پاک ہوجاتا ہے بلکہ اوصاف حمیدہ اوراخلاق جمیلہ سے خودبخود متصف ہوتا چلا جاتا ہے مثلا: یہ کہ حرص ایسی مذموم صفت ہے کہ جوانسان کی دین ودنیا کو برباد کردے جسکے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''حرص'' وہ چیز ہے جس نے پہلی قوموں کوتباہ کردیا اسی حرص نے انسے بخل کروایا، اسی نے ان سے رشتوں کوقطع کروایا، اسی نے انکوفسق وفجور پرآمدہ کیا ،اسی نے انسے بے گناہوں کوقتل کروایا (صحیح مسلم باب تحریم الظلم ،ابوداؤد، حاکم ،صحیح ابن حبان)الغرض حرص وہ مکروہ صفت جوتمام عیوب اور جرائم کی جڑ ہے جائز منافع خوری کی عادت ڈالنے پرانسان اس خبیث عادت سے بھی پاک ہوجاتا ہےاور انسان میں حلال وحرام ذرائع سے دولت جمع کرنے کی جوحرص ہے وہ اسکو اپنانے کے بعدکم ہوتی چلی جاتی ہیں بلکہ دوسروں کیساتھ ہمدردی وغمگساری انکے ساتھ عدل ایثار اور حسن سلوک کے جذبات اسکے اندر موجزن ہونے لگتے ہیں اور اسکا قلب صبر وتوکل وجودوسخااور شکروقناعت جیسی عمدہ اور محبوب خصائل سے آراستہ وپیوستہ ہوجاتا ہے۔

قرض کی جلد ادائیگی

حضرت زید بن شعنہ رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل مذہباً یہودی تھے اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا اور اس قرض کی ادائیگی کی ایک میعاد اور وقت مقرر کر دیا، ابھی وہ میعاد آنے بھی نہ پائی تھی اور اس مقررہ وقت کے آنے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے قرض کے تقاضے کے لئے آ گئے اور اس تقاضے میں انہوں نے اتنا غیر مہذب رویہّ اختیار کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک کو پکڑ کر زور سے پکڑ کر گھسیٹا اور بہت برا بھلا کہتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''عبد المطلب کے خاندان والو تم بہت ہی نا دہندہ ہو اور ہمیشہ یونہی حیلے بہانے کیا کرتے ہو'' زید کی گستاخی کو دیکھ کر جلالِ فاروقی جوش میں آ گیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غیض وغضب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''او دشمنِ خدا! تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کرتا ہے'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت مسکرا دیئے اور فرمایا کہ عمر تمہیں چاہئے تھا کہ تم اس کو یہ سمجھاتے کہ تقاضہ نرمی کے ساتھ کرنا چاہئے اور مجھ سے تمہیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ اس کا قرض ادا کر دیجئے۔ یہ فرما کر آپ نے عمر کو ہی حکم دیا کہ جاؤ اس کا قرض ادا کر دو اور بیس ۲۰ صاع کھجور اس کو اور زیادہ دے دو۔ (بیہقی، ابن حبان، طبرانی، ابو نعیم)

اس حدیث پاک سے جہاں ہم کو ایسے ہتک آمیز سلوک اور غیض وغضب

کے مواقع پر تحمل اور بردباری اختیار کرنے کا سبق ملتا ہے وہاں اس بات کا بھی درس ملتا ہے کہ قرض دار کے قرض کو جتنا جلد ہو سکے ادا کر دیا جائے ، اس کی ادائیگی میں بے جا تأخیر نہ کی جائے حتی کہ کوشش یہ کی جائے کہ جو وقت قرض کی ادائیگی کا مقرر ہے اس سے پہلے ادا کر دیا جائے ورنہ اس کو تقاضے کا پورا حق حاصل ہے کیونکہ اس کا مال ہے اور وہ اپنے مال کو جب چاہے طلب کر سکتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو تقاضے سے منع نہیں فرمایا، حالانکہ ابھی میعاد ختم ہونے میں کچھ دن باقی تھے، ہاں البتہ تقاضہ کرنے کا سلیقہ سکھا دیا جائے اور ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو قرض کی جلد ادائیگی میں اخلاقی اور معاشرتی بہت سے فوائد مضمر ہیں مثلاً ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپس کے دیرینہ تعلقات خراب نہیں ہوتے ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ روز روز کی جھک جھک اور تقاضوں سے بچپن کی دوستیاں اور قریبی رشتہ داریاں ختم ہوگئیں، اس کے علاوہ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرض کی جلد ادائیگی سے لوگوں کی نگاہوں میں اس کا اعتماد قائم ہوتا ہے اور خدانخواستہ اگر کوئی وقت اس پر پڑے اور اس کو مزید قرض کی ضرورت پیش آئے تو سابقہ اس کی روش کے پیش نظر ہر شخص اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ مشکل وقت اس پر آسانی سے گزر جاتا ہے، ادھر وہ قرض کے بار سے سبکدوش ہو کر اللہ کی بارگاہ میں بھی سرخرو ہوتا ہے اور قیامت کے دن حساب و کتاب میں اپنے لئے آسانی کر لیتا ہے۔

سود کی برائیاں

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک رؤیۂ صادقہ کا ذکر ہے کہ جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سود خور کو دیکھا آپ فرماتے ہیں کہ ”میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خون کی نہر ہے اسمیں ایک آدمی پھر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی کنارہ پر پتھر لئے کھڑا ہے جب پہلا آدمی تھک کر کنارہ کے اوپر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی اسے پتھر مارتا ہے جس سے اسکا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بنکر اسکے پیٹ میں اتر جاتا ہے اور وہ شخص پتھر کھا کر پھر اسی خون کے دریا میں غرق ہوجاتا ہے اسپر حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ جو شخص خون کی نہر میں بہتا ہوا دکھایا گیا ہے وہ سود خور ہے“۔ (صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین و کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا) اس حدیث پاک میں سود خور کی سزا یعنی خون کی نہر میں اس کو دکھا کر اسکی برائی کی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے روزی کماتے ہیں اور سود خور بغیر کسی محنت کے آسانی سے اسپر قبضہ کر لیتا ہے تو گویا وہ خون کے دریا میں بہتا ہے۔

اس سے بڑھکر سود کی اور کیا خرابی ہوگی کہ یہ انسان کو ایک طرف تو کاہل اور سست بنا دیتی ہے کہ وہ بغیر ہاتھ ہلائے لکھ پتی بنتا چلا جاتا ہے اور اسکی حرص و ہوس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ انسان جو رات دن محنت کر کے چند پیسوں کی مزدوری حاصل کرتا ہے وہ اپنی اس کمائی کو سود میں دیکر غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے، اور پھر تعجب تو یہ ہے کہ سود لینے والے میں ایسی خود

غرضی، سنگ دلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکو اپنے اس غریب بھائی کی بے چارگی پر ترس تک نہیں آتا، ظاہر ہے کوئی شخص اگر قرض لیتا ہے تو وہ اپنی مجبوری اور غربت کی بنا پر لیتا ہے اب اسکی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر مزید رقم کا بار ڈال دیا کسقدر خودغرضی اور مطلب پرستی ہے اگر مالدار لوگ ناداروں کیساتھ ہمدردانہ رعایت یا منصفانہ تعاون کا طریقہ اپنانے کے بجائے خودغرضانہ طریقہ اپنائیں گے تو آپس میں محبت والفت پیدا ہونے کے بجائے نفرت وحقارت کی خلیج حائل ہوتی چلی جائیگی اور معاشرہ انس ووداد کا گہوارہ بننے کے بجائے دشمنی وعداوت کی جہنم بن جائیگا۔

یہ وہ بلائے عظیم ہے جب تھوڑی تنخواہ پانے والے اور مزدوریاں کرنے والے پر مسلط ہوتی ہے تو انکی مختصر سی آمدنی کا اکثر حصہ اس سود میں نکل جاتا ہے اور آخر میں ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دووقت کی روٹی بھی اپنے بچوں کو کھلاسکیں اور پھر اسکا اثر انکی روحانی اور اخلاقی کردار پر اسطرح پڑتا ہے کہ وہ برائیوں اور جرائم کیطرف مائل ہوتے چلے جاتے ہیں اس کا اثر انکی اور انکی اولاد کی معیار زندگی اور معیار تعلیم پر بھی پڑتا ہے جو پست سے پست تر ہوتی چلی جاتی ہے ،علاوہ ازیں جب مزدور اور محنت کش عوام دیکھتے ہیں کہ انکی محنت کے پھل کو سود خور لے اڑتے ہیں تو اپنے کام سے انکی دلچسپی ختم ہوتی چلی جاتی ہے جسکا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم معاشی اور اقتصادی بدحالی کا شکار ہو جاتی ہے۔

اپنی مدد آپ کرنا

صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے حضرت عائشہ الصدیقہؓ سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں کیا کیا کرتے تھے تو آپ نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام کاج میں مصروف رہا کرتے تھے مثلاً کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے بازار سے سودا خود لے آتے تھے، جوتی ٹوٹ جاتی تو خود ہی گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا لیتے اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اور اپنے ہاتھ سے ہی چارہ ڈال دیتے تھے، غلام کے ساتھ ملکر آٹا گوندھ لیتے تھے، (صحیح بخاری) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کے والی اور دو جہاں کے بادشاہ تھے آپکے یہاں خدام اور کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی، آپکے دربار میں ہزاروں جاں نثار ہر آن آپ کی ایک ابرو کے اشارے پر اپنی جاں قربان کرنے کیلئے کھڑے رہتے تھے وہ آپکے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھا کرتے تھے لیکن آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کام دوسروں سے کرانے کے بجائے خود کر کے امت کو اپنی مدد آپ کے ایک زریں اصول سے آشنا کر دیا اور یہ سبق دے دیا کہ خواہ کوئی امیر ہو یا وزیر، بڑا ہو یا چھوٹا ہر ایک کو اپنا کام خود کرنا چاہیے، اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بڑا پیارا اصول ہے کیونکہ انسان کو بہت سی مصیبتوں اور احتیاجوں سے بچا لیتا ہے۔

اسلئے کہ اگر انسان دوسروں پر سہارا کرنے لگے اور اپنا ہر کام دوسروں کی

مدد سے کرے تو وہ دوسروں کا محتاج بنکر رہ جاتا ہے جسکا سب سے پہلا نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ وہ انہی کے رحم وکرم پر ہوتا ہے خواہ وہ اسکا کام بنادیں یا بگاڑ دیں، اچھا کریں یا برا کریں وہ مجبور ہوتا ہے اپنی مرضی کے مطابق تسلی بخش کام حاصل نہیں کرسکتا اسکے علاوہ دوسروں سے کام لینے کیلیئے ان سے روز روز کے تقاضوں اور دن رات کی جو دردسری ہوتی ہے وہ علیحدہ آفت ہے کام اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اس کام کو کرانے کیلیئے دوسروں کے پیچھے دن رات بھاگ دوڑ کرنا مشکل ہوتا ہے، اسکے علاوہ پیسوں کا ضیاع ایک اور دردناک پہلو ہے اس مہنگائی کے دور میں چھوٹے سے کام کا اتنا عظیم معاوضہ طلب کیا جاتا ہے اور اسکی اتنی کثیر اجرت طلب کی جاتی ہے کہ انسان حیران وششدر رہ جاتا ہے اور انسان کی جمع شدہ پونجی چند گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہوا ہو جاتی ہے۔ تو پھر کیوں نہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کر ''اپنی مدد آپ'' کے زریں اصول پر عمل کیا جائے تاکہ معاشی، معاشرتی اور اقتصادی خوشحالی کیساتھ ساتھ اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت روحانی وجسمانی فوائد بھی حاصل ہوں اور خدا اور اسکے حبیب کی رضا و خوشنودی بھی حاصل ہو۔

ہر ایک کیلئے سہولت اور آسانی پیدا کرنا

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ ایک جگہ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے آپکا طریقہ یہ تھا کہ نماز فجر میں کیف وسرور حاصل کرنیکی خاطر لمبی لمبی سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر انکی شکایت کی کہ وہ اسقدر لمبی نماز پڑھاتے ہیں کہ ہمارے لئے کھڑا رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ حضرت ابومسعود انصاری کا بیان ہے کہ یہ سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسقدر غضبناک ہوئے کہ میں نے اس سے بیشتر آپ کو آج تک اتنا غصہ میں کبھی نہیں دیکھا پھر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو لوگوں کو متنفر کردیتے ہیں جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے اسے چاہیئے کہ مختصر نماز پڑھائے کیونکہ نماز میں کمزور اور بوڑھے اور کام والے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، لہٰذا ہر ایک کا خیال رکھا جائے ۔(صحیح بخاری کتاب الصلوۃ وباب ھل یقضی الحاکم وھو غضبان)۔

اس حدیث پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کیلئے ہر چیز میں آسانی اور سہولت فراہم کرنے کے کسقدر آرزو مند اور خواہاں رہتے تھے حتیٰ کہ نماز جیسی عبادت اور وہ بھی قرآن کی طویل قرأت جیسے عظیم اجر وثواب والے کام کو بھی لوگوں کی سہولت اور آسانی کی خاطر ختم کرنے کا حکم دے دیا اسی طرح مسواک کرنا آپ کو بڑا محبوب تھا اور آپکا جی چاہتا تھا کہ میں لوگوں کو حکم دوں کہ وہ ہر نماز سے قبل مسواک کرکے اپنے منہ کو پاک وصاف

رکھیں اور ہزاروں بیماریوں سے محفوظ رہیں ۔لیکن یہاں بھی امت کی مشقت اور تکلیف آپ کے سامنے آگئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انکو حکم دیکر واجب کردوں اور یہ اسپر عمل نہ کرکے عذاب میں مبتلاء ہوجائیں لہذاانکی آسانی کی خاطر آپ نے اپنے اس فرمان اوراپنے اس حکم کو جاری کرنے سے گریز فرمایا، الغرض حضور کی ہمہ وقت یہی خواہش رہتی تھی کہ لوگوں کیلئے زیادہ سے زیادہ سہولت اورآسانی پیدا کریں او راسپر سب سے اہم واقعہ معراج شاہد ہے کہ حضور نے باربار بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوکرامت کی آسانی کیلئے پچاس نمازوں کو معاف کرواکے صرف پانچ نمازیں اللہ کے دربار سے فرض کروائیں۔

توپھر خالق کون ومکان نے بھی اپنے محبوب محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش اور آرزو کا احترام کرتے ہوئے شریعت کے تمام وہ احکام نازل فرمائے جس میں امت مسلمہ کیلئے آسانی ہی آسانی ہے پچھلی امتوں کے شرعی احکامات سے اگر انکاموازنہ کیاجائے تو اس نعمت کا پتہ چلتا ہے مثال کے طور پر ''جائے عبادت'' ہی کو لے لیجئے کہ پچھلی امتوں کی عبادت انکی مخصوص عبادت گاہوں کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمیں کوامت مسلمہ کیلئے مسجد بنادیا ہے۔ جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں ایسی ہی بے شمار مثالیں شریعت محمدی میں ہمیں جابجا نظر آئیں گی۔ بہر حال ان تمام امور سے لوگوں کو یہ ذہن نشیں کرانا مقصود ہے کہ تم بھی لوگوں کیلئے جہاں تک ممکن ہو سکے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہا کرو اگر کوئی مبلغ ہے تو اس کو چاہیئے کہ نرم اورسہل احکامات بیان کرکے لوگوں کواسلام کی طرف مائل کرے اگرکوئی واعظ ہے تو اسے چاہئے کہ

وہ شریعت کے اوامر اور نواھی کو انسے سہل انداز میں بیان کرے کہ بجائے نفرت کے اسکی طرف رغبت پیدا ہو اگر کوئی حاکم یا افسر ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے ماتحت ملازمین اور رعایا کو زیادہ سے زیادہ ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ اگر کوئی مل مالک یا زمیندار ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے مزدوروں، ہاریوں اور کسانوں کو انکے حقوق دینے میں تساہل یا سختی نہ کرے اگر کوئی کسی مصیبت سے دوچار ہے اگر تمہارا کوئی مسلمان بھائی کسی ابتلاء آزمائش اور آفت میں پھنسا ہوا ہو تو اسکی مدد کیلئے فوراً کود پڑنا چاہئے۔

معمر لوگوں کی خدمت کرنا

ترمذی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ کوئی جوان اگر کسی بوڑھے آدمی کی تعظیم اسکی عمر کی وجہ سے کریگا تو جب وہ اس عمر کو پہنچے گا تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مقرر کر دیگا جو اسکی تعظیم وتکریم کریں گے (جامع الترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی اجلال الکبیر) یوں تو ہر اپنے سے بڑے شخص کا احترام کرنا اور اسکی خدمت کرنا ضروری ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بڑے کی توقیر نہ کی وہ ہم میں سے نہیں (جامع الترمذی باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان) لیکن مذکورہ بالا حدیث میں معمر اور بوڑھے شخص کی تعظیم اور خدمت کی تخصیص اسلئے کی گئی ہے کہ یہ دور انسانی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جسمیں اپنے بڑھاپے اور ضعف و ناتوانی کے باعث لوگوں کی طرف اسکی احتیاج بڑھ جاتی ہے وہ زندگی کے مشکل ترین مسائل کو اکیلے اور تنہا اپنے نازک اور ناتواں کندھوں پر اٹھانے کے قابل نہیں رہتا، وہ جوانوں اور طاقتور لوگوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ کوئی اسکی دستگیری کردے اور اسکے کام میں اسکو سہارا دےدے، ایسے مشکل وقت میں ایسے لوگوں کی خدمت کرنا اور ان کو سہارا دینا چونکہ زیادہ ضروری اور انسانی فرض تھا، اسلئے اس حدیث میں خصوصیت کیساتھ معمر حضرات کا ذکر فرمادیا گیا۔

اود دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی عمر والوں کی طرف جوان لوگ بہت کم توجہ دیتے ہیں اور ان کے مسائل کی طرف بہت کم التفات کرتے ہیں آجکل یورپ

کا معاشرہ اور ہمارے یہاں مغرب زدہ طبقہ اسپر شاہد ہے کہ اگر گھر میں کوئی بوڑھا ہو جائے تو اس سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی جاتی ہے اسکو ایک کونے گوشے میں ڈالدیا جاتا ہے اسکے پاس بیٹھنا تو درکنار اپنے مشاغل سے چند لمحے نکال کر کھڑے کھڑے انکی دو باتیں بھی سننا دوبھر ہو جاتا ہے ایسے لوگوں کو سمجھانے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث بالا میں یہ بلیغانہ طرز اختیار فرمایا کہ جوانوں کو انکے آنے والے بڑھاپے کی یاد دلائی کہ وہ یہ نہ بھولیں کہ ان پر بھی یہ وقت آرہا ہے اگر آج ایسے وقت میں وہ معمر لوگوں کا احترام کرینگے انکی خدمت کریں گے تو کل جب ان پر یہ وقت آئیگا تو اللہ تعالیٰ انکی بھی تعظیم و تکریم کروائیگا انکو جب خدمت کی ضرورت محسوس ہوگی جب کسی سہارے کی احتیاج ہوگی جو کہ بڑھاپے میں لازمی ہوتی ہے تو اسوقت اللہ تعالیٰ دوسروں سے انکا ادب کروائیگا اور انکے کام بنوائیگا۔

مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا

بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے وہ اسپر نہ تو ظلم کرتا ہے اور نہ اس کی سلامتی اور عافیت کو ختم کرتا ہے اور اگر اس بھائی کی کوئی حاجت ہو اور وہ اسکی حاجت پوری کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی فرماتا ہے، اور اگر وہ اپنے مسلمان بھائی کے کسی غم اور پریشانی کو دور کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی سختیوں اور مصیبتوں کو اس سے دور فرمادے گا اور جو اس دنیا میں اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرے اس کے عیوب اور نقائص کو طشت ازبام نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن اس کے عیوب اور گناہوں سے پردہ پوشی فرماتا ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ص۴۲۲) اس حدیث میں مسلمانوں کو اپنے بھائیوں کی مصیبت میں کام آنے اور مشکل کے وقت ان کی مدد کرنے اور ان سے تعاون کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے اسلام کا یہ زریں اصول ہے کہ جس پر عمل کیا جائے تو رقابتیں ختم ہو جائیں اور دشمنیاں مٹتی چلی جائیں اور دلوں کی دنیا محبت واخوت کا مہکتا ہوا گلستان بن جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ اقدس کس کی نظر میں نہیں وہ زمانہ جب تمام صحابہ یکجاں شیر وشکر تھے اور انکی آپس میں کوئی رنج اور رقابت نہیں تھی اس کی وجہ وہی تعلیمات مصطفویہ تھیں جنہوں نے صحابہ کو انسانیت کا ایسا ہمدرد وغمگسار بنادیا تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں کسی مسلمان کو کوئی تکلیف ہوتی تھی تو وہ اس کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے اور اس کی تکلیف کو رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

''مواخاۃ'' کا واقعہ اس پر شاہد ہے کہ جب مکہ سے ہجرت کر کے صحابہ بے

سروسامانی کے عالم میں مدینہ پہنچتے ہیں تو اہل شہر نے ان مصیبت زدوں کا ان کی مشکل کے وقت میں ایسا ساتھ دیا ہے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان صحابہ نے اپنی جائدادوں میں سے آدھا حصہ خود رکھا اور آدھا اپنے بھائیوں کو دے دیا، مال میں سے آدھا حصہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے رکھا اور آدھا حصہ زخم رسیدہ مہمانوں کو دے دیا، گھر کے سامان میں سے آدھا خود رکھا اور آدھا اپنے ستم زدہ بھائیوں کو دے دیا حتیٰ کہ اگر کسی کے پاس دو بیویاں تھیں تو اس نے ایک بیوی خود رکھی اور دوسری بیوی کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کو دے دی۔

اسی طرح خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وہ ہمدردی اور غمگساری بارگاہ نبوت میں کیسی مقبول ہوئی جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عاشق کے ساتھ اس کے مشکل وقت میں کی تھی یعنی حضرت بلال پر جب انکے کافر اور جابر آقا کی طرف سے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے اور بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نبی آخرالزماں کا کیوں نام لیوا ہے ان کو کیوں مانتا ہے اور اس مشکل وقت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکی اس طرح مدد فرمائی کہ ان کو بڑے مہنگے اور ارزاں داموں میں خرید کر راہ خدا میں آزاد کر دیا اور اپنے اس عمل سے خدا اور حبیب خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کی کہ پھر قرآن میں خود خدا نے ان کی تعریف میں یہ آیت نازل فرمائی کہ " **وما لاحد عنده من نعمة تجزى الا ابتغاء وجه ربه الاعلى ولسوف يرضى** " اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں تھا کہ اس کا کوئی بدلہ دیا جائے بلکہ اس (یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے تو صرف یہ کام اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا ہے وہ رب جو سب سے بلند ہے اور بے شک عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔

رشوت ستانی

رشوت کا لینا اور دینا ہمارے دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک قانونی شرعی اور اخلاقی جرم ہے آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ رشوت دینے والا اور رشوت لینے والے دونوں جہنم میں جائیں گے: (مجمع الزوائد للہیثمی ۴،۱۹۹۔ الترغیب والترھیب للمنذری ۳،۱۴۰) ایک اور حدیث مبارک میں فرمایا کہ ان دونوں پر لعنت ہو (سنن ابوداؤد کتاب الاقضیہ) لینے والے تو واضح طور پر مجرم ہیں لیکن دینے والے پر اسلئے لعنت بھیجی گئی کہ وہ اس جرم کو بڑھانے میں اسکے مددگار اور معین بنے ہیں اگر دینے والے نہ دیتے اسکو یہ عادت نہ پڑتی اور وہ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہ کرتا اور اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ بہت سے ایماندار لوگ عہدوں پر ہوتے ہیں لیکن دینے والوں کی روش سے مجبور ہو کر ایک دن اسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لہٰذا اگر ہر شخص یہ عہد کر لے کہ وہ کبھی رشوت دیکر کام نہیں کروائیگا تو یہ برائی معاشرہ سے بہت جلد ختم ہو جائے اور جب برائی ختم ہو جائیگی تو معاشرہ بہت سی برائیوں اور پریشانیوں سے اور دکھوں سے خود بخود پاک ہوتا چلا جائیگا مثلاً، ظلم وتعدی جو معاشرہ کا سب سے اہم اور درد ناک پہلو ہے اس سے ہر شخص کو نجات مل جائیگی پھر کوئی شخص پیسہ دیکر ناحق فیصلے نہیں کروا سکے گا کوئی شخص چند ٹکے دیکر غنڈہ گردی اور لاقانونیت نہیں پھیلا تا پھریگا، پھر قانون کی بالادستی قائم ہو جائیگی، قانون کی گرفت سے لوگ ڈریں گے، چوری، ڈکیتی، زنا، فحاشی، عریانی، اغواء الغرض اس جیسے بہت سے ہیبت ناک جرائم

کا ارتکاب پھر سر عام نہ ہوگا بلکہ جرائم آہستہ آہستہ مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے چونکہ رشوت ستانی کا خاتمہ تمام اچھائیوں کی بنیاد اور اسکا وجود تمام برائیوں کی جڑ ہے اسی لئے آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اسکی شدت سے تاکید فرمائی اور صحابہ کرام کو سختی کیساتھ اس کے لینے سے منع فرمایا خواہ وہ تحفہ ہو یا ھدیہ کسی کام سے بھی دیئے جائیں چنانچہ عمال کو آپ نے رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی بھی ممانعت فرمادی تھی (سنن ابوداؤد کتاب الاقضیہ و کتاب الجہاد)۔

حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک عامل نے آکر آپ کے سامنے مال رکھا اور عرض کیا کہ حضور یہ مال صدقے کا ہے اور یہ تھوڑا سا مال وہ ھدیے اور تحفے ہیں جو وہاں کے لوگوں نے مجھے دیئے ہیں یہ سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور منبر پر جلوہ افروز ہو کر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے عامل کا کیا حال ہے کہ جسکو ہم بھیجتے ہیں تو وہ آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھ کر دیکھے کہ اسکو تحفے ملتے ہیں یا نہیں ملتے قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ اس مال میں سے جو کچھ بھی لیگا خواہ وہ اونٹ ہوں یا گائے ہوں یا بکریاں وہ سب قیامت کے دن اسکی گردن پر لاد دیا جائیگا۔ (صحیح بخاری، باب ھدایا العمال)

غصہ کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ غصہ آدمی کو ایسا کر دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو (مشکوۃ باب الغضب والکبر) ایلوا اور شہد کی تمثیل لاکر آنحضرت کو بتانا یہ مقصود تھا کہ آدمی کتنے ہی شیریں اخلاق، اور عادات کا مالک کیوں نہ ہو اگر وہ غصیلی ہے تو اس سے ہر شخص نفرت کریگا اور اس سے دور بھاگے گا گویا کہ یہ ایک ایسی برائی ہے کہ جسکی وجہ سے اسکا تمام حسن ماند پڑ جائیگا اسکی دیگر اخلاق کی شیرینی تلخی میں تبدیل ہو جائیگی یہی وجہ ہے کہ باکمال شخصیتوں نے اپنے کمالات میں نکھار لانے کیلئے اور عمدہ خصائل کی مٹھاس کو باقی رکھنے کی غرض سے غصہ کو ضبط کرنے کی مشق اور اسکے برداشت کی عادت ڈالنے کیلئے بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔

چنانچہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت سلمان فارسی کو گالی دی اسپر برہم یا غصہ ہونے کے بجائے آپ نے اسکو ضبط کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میری نیکیاں تیری گالی سے زیادہ ہیں تو مجھے کوئی غم نہیں اور اگر تیرا کہنا میرے گناہوں سے زیادہ وزنی ہے تو واقعی جو تو نے کہا میں اس سے بھی برا ہوں۔

اس ہی طرح مالک بن دینار کو ایک شخص نے کہا کہ تو ریا کار ہے آپ نے بکمال ضبط کا مظاہرہ فرمایا کہ تو نے خوب پہچانا یہ ان اولیائے کرام نے یہ غصہ کو ضبط کرنے کا طریقہ اپنے آقا و مولا اور کائنات کے تاجدار حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا جس کے حلم کی مثال تاریخ عالم کے اوراق میں ملنی مشکل ہے

غور کیجئے کہ وہ کون سی تکلیف اور ایذاء تھی جو دشمنان اسلام نے آپ کو نہ دی تھی لیکن جب انتقام لینے کا وقت آیا اور وہی تمام کفار قیدی بن کر فتح مکہ کے دن حضور کے سامنے لائے گئے تو آپ نے "**لاتثریب علیکم الیوم**" فرما کر سب کو معاف کر دیا اس سے بھی زیادہ غصہ کا وہ وقت تھا جب منافقوں نے آپکی محبوب بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ پر نعوذ باللہ تہمت لگا کر پورے شہر میں بدنامی پھیلا دی تھی لیکن اسوقت بھی اس حلم کے پیکر نے کسی سے کوئی تعرض نہ کیا اور اس وقت غصہ کو پی کر حلم کی ایک مثال قائم کر دی۔

ہم غلامان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چاہئے کہ اپنے آقا و مولیٰ کی سیرت مقدسہ کا اتباع کرتے ہوئے ایسے غصہ کے مواقع پر غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کریں اور اسکا عملی طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ جب تمہیں غصہ آئے تو پانی پی لو کہ پانی آتش غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ غصہ کے وقت فوراً سجدہ میں گر کر اپنے سر کو خاک پہ رکھ دے تو غصہ فوراً ختم ہو جائیگا دراصل اس فعل کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کے حضور اپنی بے مائیگی اور کمتری کا احساس اگر اجاگر کرے گا تو غصہ خود بخود ختم ہو جائیگا اسی امر کی طرف یہ واقعہ بھی اشارہ کر رہا ہے کہ ایک روز حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غصہ میں کسی کو لونڈی کا بچہ کہہ دیا اسپر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوذر تو اسوقت تک کسی سے بہتر نہیں جب تک کہ تو تقوی اور پرہیزگاری سے کام نہ لے (صحیح بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ) تو یہاں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلم اور آپس میں مساوات کے تصور کو قائم فرما کر انکے غصہ کو فرو کر دیا۔

کسی پر لعنت بھیجنا

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لعنُ المومن کقتلہ" کسی پر لعنت بھیجنا اس کے قتل کے برابر ہے (صحیح بخاری، کتاب الاداب باب ما نہی عن اسناد اللعن) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان پر لعنت بھیجنا سخت ترین گناہ ہے اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ لعنت کے لغوی معنی دور کر دینے اور ہٹا دینے کے ہیں تو جب انسان کسی مسلمان پر لعنت بھیجتا ہے تو گویا بالفاظ دیگر یا تو وہ اسکو بد دعا دیتا ہے کہ خدا کی رحمت سے دور ہو جا تو یہ بھی درست نہیں اس لئے کہ خدا کی رحمت اپنے ہر مطیع اور فرمانبردار بندہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اسکو خدا کی وسیع رحمت سے دور ہونے کی بد دعا دیں، یا اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ یہ شخص خدا کی رحمت سے دور ہو گیا ہے اور یہ بھی درست نہیں اسلئے کہ غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے۔

اگر چہ بظاہر وہ کتنا فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو لیکن کیا معلوم اس نے کوئی ایسا عمل کر لیا ہو کہ وہ خدا کا محبوب بن گیا ہو اور اس ایک عمل خیر کی وجہ سے اللہ نے اسکے تمام گناہوں کو معاف کر کے اسکو اپنا مقرب بنا لیا ہو لہٰذا ہم اس مقرب کیلئے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی رحمت دور ہو گیا لہٰذا شریعت مطہرہ نے کسی خاص معین شخص پر لعنت بھیجنے کی سخت ممانعت فرمائی اگر کوئی شخص کسی مسلمان پر لعنت بھیجے گا تو حدیث کی رو سے وہ لعنت اسی پر لوٹے گی جیسا کہ ابو داؤد کی ایک روایت

ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ لعنت آسمانوں کی طرف جاتی ہے لیکن آسمان کے دروازے بھی اس کے لئے بند کردئے جاتے ہیں پھر وہ زمین کی طرف آتی ہے لیکن اسکے دروازے بھی اس کے لئے بند کردئے جاتے ہیں پھر وہ اسکی طرف جاتی ہے جس کو لعنت کی گئی تھی اگر وہ اسکا اہل ہے یعنی کافر تھا یا فاسق فاجر تھا تب تو ٹھیک ہے ورنہ اس لعنت کا وبال اور اسکا سخت گناہ دینے والے کو پڑتا ہے (سنن ابوداوٗد کتاب الادب، باب فی اللعن) اس مقام پر اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ جب معین اشخاص پر لعنت بھیجنا منع ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض معین کفار کو کیوں لعنت بھیجی تو اسکا جواب بھی ضمناً ماقبل آ گیا ہے کہ لعنت بھیجنا ہمیں اس لئے منع ہے کہ ہمیں اس شخص کے انجام کی خبر نہیں کہ آیا یہ شخص کافر تھا یا مؤمن، فاسق ٹھہرا ہے یا متقی، جہنمی ہے یا جنتی، لیکن یہ چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں اسلئے کہ آپکی نگاہوں سے کائناتِ ارضی وسماوی کی کوئی شئی پوشیدہ نہیں "ما کان وما یکون" کا تمام علم اللہ نے اپنے حبیب کو عطاء فرمایا حتی کہ یہ بھی بتا دیا کہ فلاں شخص جنتی ہے فلاں شخص جہنمی ہے چنانچہ عشرہ مبشرہ مشہور ہیں جن کے جنتی ہونے کی سرکار نے بشارت دے دی ہے۔

اس ہی طرح کفار میں سے بعض لوگوں کے جہنمی ہونے کی خبر آپ نے ہم کو بھی دے دی تو چونکہ ہر شخص کے مؤمن یا کافر ہونے مقرب خدا یا مردود بارگاہ ہونے کی خبر اللہ نے آپکو دے دی اسلئے آپکا انکے انجام کو دیکھتے ہوئے فرمانا کہ اس پر لعنت ہو اور یہ خدا کی رحمت سے دور ہو بالکل درست اور بجا ہوا اور واقعہ کے

عین مطابق ہوا، بعض علماء نے اس کا ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ "**اللھم انما انا بشر فای المسلمین لعنته او سببته فاجعلها له ذکاۃ واجرا**" (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب من لعنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ اے اللہ میں بشر ہوں اگر میں نے بتقاضائے بشریت کسی مسلمان کو لعنت یا گالی دے دی ہو تو اس لعنت اور گالی کو اس مسلمان کی پاکی اور اجر کا باعث بنا دیجو، لہٰذا اگر وہ شخص کافر ہو جسکو آنحضرت نے لعنت کی ہے تب تو وہ لعنت اپنے اپنے محل پر ہوگی ورنہ اگر وہ مسلمان ہو تو اسکے گناہوں سے معافی اور اسکے مزید اجر و ثواب کا باعث بن جائیگی اسلئے کہ یہ رحمۃ للعالمین کی لعنت ہے وہ خود بھی رحمۃ للعالمین ان کی ہر اداء انکا ہر فعل رحمت ہے مسلمانوں کیلئے۔

بدکلامی

ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جوشخص اللہ اور روز جزاء پر یقین رکھتا ہے اسکو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے (صحیح مسلم کتاب الایمان) اس حدیث مبارک میں بدکلامی سے احتراز کرنے اور خوش کلامی کی ترغیب ایسے شخص کو دی گئی ہے جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے گویا یہ فرما کر اسطرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ بدکلامی سے وہ ہی شخص اجتناب کریگا جسکا قیامت پر اور روز جزاو سزاء کے دن پر کامل ایمان ہوگا کیونکہ وہ یہ یقین رکھتا ہوگا کہ اگر آج اس دنیا میں کسی کے ساتھ برائی کی تو کل اسکا بدلہ اسکو ضرور ملیگا لہٰذا کسی کے ساتھ بدکلامی سے پیش نہیں آئیگا بلکہ کسی نے اسکے ساتھ بدکلامی کرلی تو وہ قرآن کے اس ارشاد کے مطابق کہ "**واذاخاطبهم الجاهلون قالوا سلاما**" وہ خاموشی کے ساتھ ایسے جاہلوں کے پاس سے گزر جائیگا۔ اور اسکے جواب میں بدکلامی کرکے اپنی زبان اور اپنے دل کو گندگی سے آلودہ نہیں کریگا۔

کیونکہ اسے یقین ہوگا کہ اسکی اس تلخ کلامی کا کل قیامت کے دن اسکو ضرور بدلہ ملیگا۔ قیامت کے دن تو بہرحال بدکلامی کا بدلہ ضرور ملیگا مگر اس دنیا میں بھی بدکلامی کا ثمرہ ظاہر ہوجاتا ہے یعنی بدزبانی کرنے والے کو ہر شخص نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو اسکے باعث جھگڑے اسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ قتل و غارتگری تک نوبت پہنچ جاتی ہے بعض دفعہ وہ اپنے بنے بنائے

کام اس کی وجہ سے خراب کر بیٹھتا ہے اور مالی ،جسمانی روحانی اور اقتصادی نقصانات سے دوچار ہو جاتا ہے ۔اس ہی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ''من صمت نجا'' (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد، ترمذی، دارمی، بیہقی ص ۴۱۳) کہ جس شخص نے خاموشی کو اپنا شعار بنایا وہ نجات پا گیا یعنی آخرت کے عذاب سے بھی بچ گیا اور اس دنیا میں ہر قسم کی پریشانی، تکالیف اور نقصانات سے بھی محفوظ ہو گیا۔

یاد رکھئے کہ تلخی اور کڑواہٹ سے انسان دور بھاگتا ہے جبکہ شیرینی اور مٹھاس کی طرف وہ راغب ہوتا ہے لہٰذا جب انسان تلخ کلامی کرتا رہتا ہے تو اسکے دوست احباب رشتہ دار اس سے دور بھاگنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔کبھی اسکو کوئی مشکل پیش آجائے تو اسکا کوئی ساتھ دینے والا اسکے ساتھ ہمدردی کے دو بول بولنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ہے جبکہ خوش اخلاق اور خوش مزاج شخص کے ساتھ لوگ اسکے کلام کی شیرینی اور گفتگو کی مٹھاس کے باعث چپکے رہتے ہیں اسکے حلقہ احباب میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہر شخص اس پر اپنی جان سے نثار ہو جاتا ہے۔

حلم اور بردباری

''حلم'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی اشتعال انگیز اور ناروا بات کو برداشت کرلیا جائے اور قدرت و طاقت ہونے کے باوجود اس سے کوئی انتقام یا بدلہ نہ لیا جائے بلکہ قصوروار کو اس کا قصور معاف کر دیا جائے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور غصے کی حالت میں دشمن سے درگزر کر دینا اور اس سے انتقام نہ لینا حقیقت یہ ہے کہ بڑی مردانگی اور اولوالعزمی کا کام ہے اسی لئے آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ حقیقی پہلوان تو وہ ہے جو غصہ اور غضب میں اپنے سرکش نفس کو پچھاڑ دے اور اس کو شکست دیکر انتقام لینے سے باز رکھے (جامع الترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب)۔

حقیقت یہ ہے کہ اسکا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے یا کوئی ناروا سلوک کرے یا اس کی توہین کرے یا بھری محفل میں اس کو گالی وغیرہ دیکر اسکی تذلیل کرے ایسے وقت میں انسان کا خون کھول اٹھتا ہے اور ایسی صورت میں وہ اپنے حریف سے انتقام نہ لینے کو اپنی کمزوری سمجھتے ہوئے اسکی ہلاکت کے درپے ہو جاتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس وقت خالق دو جہاں اور اس کے محبوب کی نگاہ میں انتقام لینا بہادری نہیں بلکہ اپنے دشمن کو معاف کر کے اس سے انتقام نہ لینا، یہ بہادری اور جوان مردی ہے لوگ پہلوانی سیکھتے ہیں اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف پر بڑے بڑے داؤ آزماتے ہیں اور اس کو شکست

دیکر مخلوق سے داد و تحسین وصول کرتے ہیں لیکن ہائے افسوس ''غصہ اور غضب کے اکھاڑے'' میں نفس کو شکست دیکر اپنے خالق و مالک کو خوش کرنے اور خالق کائنات سے داد وصول کرنے کا انہیں کبھی خیال تک نہیں آیا۔

صفت حلم کی فضیلت اور اہمیت کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن میں متعدد بار اللہ تعالی نے اس صفت حسنہ سے خود اپنے آپ کو متصف فرمایا اور تمام انبیاء واولیاء غرض اپنے تمام محبوبوں کو اس صفت سے حصہ وافر نصیب فرمایا اور اپنے حبیب دو جہاں کے والی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ''حلم'' عطاء فرمایا کہ اپنا مظہر اتم بنادیا اسلئے کہ اسکے حلم کی شان یہ ہے کہ اسکی مخلوق جو زندگی کے ایک ایک سانس میں اسکی منت کش احسان ہے وہ ہر وقت اسکی نافرمانی کرکے اس کے غضب کو دعوت دیتی ہے لیکن اس کے باوجود اس خالق و مالک کی طرف سے کبھی انسے انتقام نہیں لیا جاتا اور جسطرح اسکے دوستوں کیلئے رزق بھیجتا ہے اسی طرح اسکے دشمنوں کے لئے بھی رزق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں دنیا کی ہر آسائش ان کو مہیا ہوتی ہے اور قدرت کے باوجود ان سے کبھی انتقام نہیں لیا جاتا خدا کی اس صفت حلم کا عظیم جلوہ اسکے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی ہمیں اسی طرح جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔

طائف کے بازاروں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے گئے، طعن وتشنع کے تیر پھینکے گئے کفار مکہ نے آپ کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائیں، کبھی گالیاں دیں، تو کبھی جسم پر نجاستیں ڈالیں، کبھی راستے میں کانٹے بچھائے، تو کبھی گلے میں پھندا ڈالا، کبھی جادوگر کہا، تو کبھی پاگل بتایا، حتی کہ آپ کی پیاری زوجہ محترمہ حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمتیں لگائی گئیں، یہ ایک ایسا وقت تھا کہ بڑے سے بڑا حلیم انسان بھی اس وقت غصہ سے بے قابو ہو جاتا لیکن اس پیکرِ حلم و بردباری نے خون کا گھونٹ پی کر ان کے لئے دعائیں کیں اور قدرت کے باوجود کبھی کسی سے انتقام نہ لیا حالانکہ طاقت و قدرت کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ کی زبان سے صرف دو لفظ بھی ان دشمنوں کی بددعا کے لئے نکل جاتے تو انکی بستیوں کی بستیاں تباہ ہو جاتیں، اور ان کے نام ونشان تک مٹ جاتے لیکن آپ نے حلم کا مظاہرہ فرما کر امت مسلمہ کو یہ سبق دے دیا کہ خدا کے یہاں محبوب بننے کا راستہ یہی ہے کہ انسان اپنے جانی دشمنوں سے درگزر کر جائے اور قدرت و طاقت کے باوجود انتقام نہ لے ''حلم'' کے بارے میں پرانے دانشوروں نے بھی بڑی پیاری باتیں کہی ہیں، چنانچہ لکھا ہے کہ ایک روز نوشیرواں نے ابوذر جمہر سے پوچھا کہ حلم کیا ہے؟ اس نے کہا کہ انسان کے جتنے اچھے اور عمدہ خصائل ہیں حلم ان کی جان اور ان کا ملح یعنی نمک ہے اور دلیل یہ دی کہ اگر حلم کو الٹا کر کے پڑھا جائے تو ملح بن جاتا ہے جس کے معنی نمک کے ہیں لہذا جس طرح بغیر نمک کے کی کھانے میں مزہ نہیں اسی طرح بغیر حلم کے کسی خلق میں جمال نہیں۔

خوش خلقی

حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایک شخص بارگاہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! دین کی کیا تعریف ہے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ '' خوش خلقی اور اچھی عادت'' اس نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو یہی جواب عطا فرمایا اسطرح کئی بار حضور کے دائیں بائیں آ کر پھر وہ یہی سوال دہراتا رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل یہی جواب عنایت فرماتے رہے (مکاشفۃ القلوب للامام غزالی ص ۶۱۷) اس حدیث سے خوش خلقی اور اچھی عادت کی اسلام میں اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعریف میں صرف اور صرف خوش خلقی کا ذکر فرما کر گویا اشارہ کر دیا کہ ہمارے مذہب کی جان اور ہمارے دین وملت کی روح یہی خوش خلقی ہے، اگر کوئی شخص اپنے ہم نشین کیساتھ اچھے برتاؤ اور عمدہ اخلاق کیساتھ پیش آئے تو اسکی تمام عبادات اور دوسری نیکیاں بھی مقبول ہیں ورنہ انکی حیثیت ایک بے روح جسم اور ایک بے جاں قالب کی سی ہے جسکی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک عورت کا ذکر کیا گیا جو بڑی متقی، پرہیزگار اور شب زندہ دار تھی لیکن اپنی بداخلاقی اور ترش روئی کے باعث اپنے ہمسایوں کو بہت ناخوش رکھتی تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ اسکی تمام عبادتیں رائیگاں گئیں اسکی بدخلقی اسکے اچھے اعمال کو اسطرح خراب

کر رہی ہے جسطرح سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے پھر فرمایا کہ وہ جنت کی بہاروں سے لطف اندوز نہ ہو سکے گی۔ (ادب المفرد بخاری باب من لا یوذی جارہ)۔

بہر حال خوش خلقی اور خندہ جبینی کی عادت انسان کے اعمال اور عبادات کو جہاں بارگاہ الٰہی میں مقبول بنا دیتی ہے وہاں خود انسان کو بھی خدا اور اسکے بندوں کی نگاہ میں معزز، مکرم اور مقبول و منظور بنا دیتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اسکی بدولت انسان مخلوق خدا کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے اور پھر وہ ایک ایسا عظیم حکمراں اور فرمانروا ہو جاتا ہے، کہ جسکی حکومت انسانوں کی گردنوں پر نہیں بلکہ دلوں پر ہوتی ہے ،تاریخ شاہد ہے کہ جب اس صاحب خلق عظیم اعلیٰ مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدائے توحید بلند کی تو ہر طرف سے دشمنی وعداوت اور نفرت وحقارت کے شعلے بھڑک اٹھے لیکن اسوقت آپکا یہی خلق عظیم تھا جس نے نفرت وحقارت کے دہکتے ہوئے انگاروں کو انس ومحبت کے پھولوں میں بدل دیا اور وہ جہنم زار معاشرہ دیکھتے ہی دیکھتے چمن زار بن گیا اور یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ عرب کے بدؤں اور وحشیوں نے اسی خوش خلقی اور اخلاق حسنہ کا آپ سے درس لیکر اسکے ذریعہ دنیا کی بڑی بڑی اقوام کو اپنا زیر نگیں کر لیا اور اسی اخلاق حسنہ کی کرشمہ سازی تھی کہ اسلام کا ڈنکہ تمام عالم میں بج گیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلواروں اور ہتھیار کے ذریعے پھیلا میں کہتا ہوں کہ ہاں ہتھیاروں کے ذریعے پھیلا لیکن وہ ہتھیار لوہے یا پیتل کے نہیں تھے بلکہ وہ اخلاق حسنہ اور اعلیٰ کردار کے ہتھیار تھے ،اور ہاں اخلاق جمیلہ کے ہتھیاروں میں خدا نے وہ طاقت رکھی ہے کہ جب بھی یہ استعمال کیے جاتے ہیں دلوں کی دنیا بدل

کے رکھ دیتے ہیں۔ کسی فارسی شاعر نے خوب کہا۔

مہ ۔ ے کر ہ سپ ارمش کہ ل ، ود

، رل ق وف دارات وال ش اختہ ن

ت وآن سہ اخ مت کر ارے ہ نہ ر میں چہ ہ اں

کر ہ ز ہ ت وال ي ہ تیغ وسیہ اں سہ اختہ ن

یعنی اگر تمہیں کوئی مشکل سے مشکل مہم آپڑے تو اس کو خوش خلقی اور رفق ونرمی سے حل کیا تو وہ آسان ہو جائیگی کیونکہ نرمی اور خوش خلقی سے وہ وہ کام ہو جاتے ہیں جو تیغ وسناں اور تیر وشمشیر سے بھی نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اشاعت اسلام کا مشکل ترین کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ترین اخلاقی مظاہرہ کے باعث آسان ہوتا چلا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اعلیٰ اخلاق کیا تھے اسکی ایک جھلک ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول میں نظر آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں فرمائی تھی حتیٰ کہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کسی کی کوئی بات ناگوار گزری تو آپ نے اس سے اس ناگواری کا اظہار اس شخص کے سامنے نہیں فرمایا کہیں اسکا دل نہ ٹوٹ جائے۔ (شمائل الترمذی بیان اخلاق)۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو قلوب کی رنجیدگی اور دلوں کی ٹھیس کا کتنا خیال تھا آج اپنی بداخلاقی کے باعث دلوں کو ایذاء دینا اور قلوب کو رنجیدہ کرنا ایک کھیل بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ رُو بزوال ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے اخلاق اور خوش خلقی کیساتھ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صحبت بد سے اجتناب

آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب دین کے دو بھائی آپس میں ملتے ہیں تو ان کی مثال دو ہاتھوں کی ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا ہے۔ آپ کے اس ارشاد پاک کا مقصد اور مطلب یہ ہے کہ صحیح معنی میں دوست وہی ہوتے ہیں جن کی معیت وصحبت میں انسان فاسد نظریات، برے عقائد وخیالات اور خراب سیرت وکردار سے پاک ہو جائے اور اچھے اخلاق و عادات اور عمدہ نظریات واوصاف سے متصف ہوتا چلا جائے، اس کے رفیق اور دوست کا وجود اور اس کی محبت ومعیت اس کے لئے آب حیات ہو جو اس کے اوصاف رذیلہ کو دھو کر اوصاف حمیدہ سے اس کو آراستہ وپیراستہ کر دے، حقیقت میں ایسے ہی لوگ دوست کہلانے کے قابل بھی ہیں۔ اس کے برخلاف وہ لوگ یا وہ نام نہاد دوست جن کے پاس بیٹھ کر بجائے اچھی عادات حاصل ہونے کے رہی سہی اچھی خصلتیں اور عادتیں بھی ختم اور فنا ہو جائیں ان کو دوست کہنا بھی ''دوستی'' کے لفظ کی توہین ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دوستوں کو دو ہاتھوں سے تشبیہ دے کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ دوست حقیقت میں وہ ہی ہے کہ جس کے پاس بیٹھ کر بری عادتیں ڈھل جائیں اور مٹ جائیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے میل اور گندگی کو دھو کر اس کو پاک اور صاف کر دیتا ہے۔

دراصل تعمیر کردار میں ''صحبت'' کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، انسان

صحبت کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اگر اس کے اچھے ساتھی ہیں تو
ان کے عمدہ خیالات اور عادات کا اس میں ضرور اثر آئے گا اور اگر خدانخواستہ
بروں کی صحبت میسر آ گئی تو لامحالہ ان کے برے اثرات بھی اس پر ضرور اثر انداز
ہونگے اگرچہ خواہ وہ کتنا ہی عقلمند، بزرگ ودانا ہو، پڑھا لکھا اور تعلیم یافتہ ہو اگر اس
کو بری صحبتیں ملی ہوئی ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر
گمراہیوں کے صحراء. ں بھٹک جائے گا اور اپنی زندگی کو برباد کر بیٹھے گا۔ یہی وجہ
ہے کہ ہر مذہب اور ہر دور کے بڑے بڑے علماء، عقلاء اور مفکروں نے اپنے اپنے
کلام میں بری صحبتوں سے اجتنا۔ کرنے اور اچھی صحبتوں کو اختیار کرنے کی بڑی
تاکیدیں کی ہیں۔

صحبت تو وہ چیز ہے کہ بے جان چیزیں بھی جس کے باعث متاثر ہو جاتی
ہیں تو پھر انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ کیوں نہ ''صحبت'' کے اثرات سے متاثر
ہوگا، شیخ سعدی نے اس کی بڑی خوبصورت مثال دی اور فرمایا کہ ایک روز میں نے
ایک ''مٹی'' کو دیکھا کہ اس میں سے مشک وعنبر کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں، میں نے
اس سے پوچھا کہ ''مٹی'' مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ تو ''مٹی'' ہے یا مشک
وعنبر کی ڈلی ہے، اس نے کہا کہ میں تو وہ ہی مٹی ہوں جس کو لوگ اپنے پاؤں تلے
روند دیتے ہیں، سعدی نے کہا کہ پھر تیرے اندر یہ مہک اور خوشبو کہاں سے آئی
ہے، اس نے جواب دیا کہ یہ صدقہ ہے پھولوں کی معیت کا، کیونکہ چند لمحے میں
پھولوں کی معیت میں اور ان کے ساتھ رہی، اس صحبت کی وجہ سے میرے اندر بھی
خوشبو بس گئی اور اب میں بھی پھولوں کی طرح مہک رہی ہوں۔

جمال ہم نشیں در من اثر کرد

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

بہر حال شیخ سعدی کا مقصد یہ ہے کہ وہ مٹی پھولوں کی چند لمحوں کی صحبت اختیار کرتی ہے تو اس کی خوشبو سے متصف ہو کر مہکنے لگتی ہے اگر ہم خاک کے پتلے بھی اچھے اخلاق و عادات کے پھولوں سے مہکتے ہوئے راستوں کے پاس بیٹھیں گے تو ہم بھی ان کے اخلاق سے متصف ہو کر مہکتے چلے جائیں گے اور یہ معاشرہ جو برے عادات اور اخلاق کی وجہ سے کرب اور بے چینی سے دوچار ہے اس کو طمانیت اور سکون حاصل ہو جائے گا اور انس و محبت کی ہواؤں سے ساری فضا پر بہار ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا حدیث سے ایک اور چیز کا بھی پتہ چل گیا وہ یہ کہ ہاتھ کا کام دھونے کا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوست کو ہاتھ سے تشبیہ دی ہے لہٰذا دوست کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی اور رفیق کے عیوب اور برائیوں پر نظر رکھے، اس کی غلطیوں اور برائیوں پر اس کو آگاہ کرتا رہے اور ادھر دوسرے دوست کو بھی یہ چاہئے کہ وہ اس غلطی کا اقرار کرے، اپنی انا یا بے عزتی کا مسئلہ بنا کر خواہ مخواہ غضبناک نہ ہو اور نہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے بلکہ شکریہ کے ساتھ اس کے شکوہ کو قبول کرتے ہوئے اپنی اصلاح کی کوشش کرے اور اس عیب کو اپنے اندر سے نکالنے میں مصروف ہو جائے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی ہدایت کی بات بتا دی جائے یا اس کے کسی عیب اور برائی سے اس کو روکا جائے تو اس قدر غصہ ہو جاتا ہے جیسے اس

کی ماں بہن کو کوئی گالی دے دی ہوتی کہ بعض تو آستینیں چڑھا کر مارنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں اس طرح معاشرے کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی، معاشرے کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص خود اپنے عیوب پر نظر رکھے، اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی اصلاح کرتا رہے ایسے میں اگر کوئی دوسرا اس کے کسی عیب کی نشاندہی کر دے تو اس کا ممنون اور شکر گزار ہو کہ اس دوست نے مجھے ایک ایسی اخلاقی گندگی کی طرف توجہ دلا دی جس کے باعث میں خالق اور مخلوق سب کے لئے قابل نفرت بن گیا تھا اور میری نگاہ سے اب تک وہ چیز پوشیدہ تھی۔

حیاء

''حیاء'' ایمانی صفات اور کمالات میں سے وہ اہم کمال اور وصف ہے جسکے بغیر مومن اور مسلم ہونے کا تصور قطعاً نامکمل ہے، چنانچہ اسپر آں حضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک شاہد ہے کہ "الحیاء شعبة من الایمان" (صحیح بخاری باب الایمان) کہ حیاء ایمان کا ایک اہم شعبہ ہے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسکے دل میں حیاء نہ ہو اسلئے کہ یہ وہ بنیادی اور اساسی وصف اور صفت ہے جو بہت سی برائیوں کو روکنے کا اور بہت سی اچھائیوں کے اختیار کرنے کا سبب بنتی ہے اگر کسی کا قلب صحیح معنوں میں حیاء کے جذبات سے لبریز ہے تو وہ کبھی کسی فحاشی اور عریانی کی طرف مائل نہیں ہوگا۔ وہ کبھی اپنے کسی مسلمان بھائی کو دغا اور دھوکہ نہیں دیگا، وہ کبھی تجارت یا لین دین میں بد دیانتی اور گڑبڑ نہیں کریگا، وہ کبھی رقص اور سرود کی محفلیں سجا کر اور اسمیں غیر شرعی افعال کر کے لوگوں کے دین، ایمان کو تباہ نہیں کریگا۔

ہاں اگر خدانخواستہ اسکے قلب سے یہ شرم وحیاء کا وصف زائل ہوگیا تو پھر ہر برے سے برا کام وہ بآسانی کر گزریگا اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ "اذافاتك الحیاء فافعل ماشئت" (صحیح بخاری کتاب الادب باب اذالم تستح) کہ جب تیرے اندر سے حیاء ختم ہوگئی تو اب جو جی چاہے کر اب کوئی چیز ایسی نہیں جو تجھے گناہوں اور برائیوں سے باز رکھ سکے اب تجھے جوئے اور سٹے کے اڈوں کی طرف جانا بھی آسان ہوجائیگا، فحاشی اور بدمعاشی کے اڈوں کے چکر لگانے میں بھی تجھے کوئی عار نہ ہوگی، سفاکی اور خون ریزی کا بازار گرم

کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی، اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں کوایذ[illegible]نے اور انکے شیشہ دلوں کوتوڑنے میں بھی کوئی بات نہ ہوگی، اسلیئے کہ ان سب برائیوں سے روکنے والی تیرے اندرایک صفت حیاء تھی وہ ختم ہوگئی۔

توسب کچھ ختم ہوگیا اوراگر وہ صفت باقی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس صفت حیاء وشرم کے سبب وہ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچتا چلا جائیگا بلکہ طاعات اور عبادات کی طرف اس کا دل کھنچتا چلا جائے گا،اور وہ خدا کا ایک مطیع اور فرمانبردار بندہ بن کر دارین کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہوجائیگا۔

لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اس عظیم اور اہم ایمانی وصف کو حاصل کرنے اور نیکیوں کی جڑ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں تا کہ اسکے سبب خود بخود برائیوں سے بچتے چلے جائیں، اور اچھائیوں سے متصف ہوتے چلے جائیں اور اس صفت کو اپنے اندر کسطرح پیدا کیا جائے اسکے متعلق مشہور تصوف کے امام حضرت جنید بغدادی کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے کہ آپ سے کسی نے جب حیاء کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ان بے شمار انعامات اور احسانات کو یاد کرے، جو اسپر اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی تقاصیر اور کوتاہیوں کو یاد کرے اور انکا مشاہدہ کرے جب یہ دونوں چیزیں اسکے سامنے آئیں گی تو اسکے دل میں خود بخود ایک حالت پیدا ہوجائے گی، اسی حالت کا نام "حیاء" ہے اور جب یہ صفت اس کے اندر پیدا ہوجائے گی تو پھر درجہ اسکی حفاظت کا آتا ہے، اور اسکی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ ان اعمال، اقوال، اور افعال سے حتی الامکاں پرہیز کرے جو حیاء کی زیور کو ریزہ ریزہ کردیتے ہیں مثلاً فحش کلامی، فحش گوئی، گندے اور بے ہودہ رسائل اور کتابوں کے مطالعہ اور اس قسم کی مناظر کی دید اور اس قسم کی صحبت سے اجتناب کیا جائے۔

امانت ودیانت

آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ " **لاایمان لمن لاامانة لہ** "(کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۔ بحوالہ طبرانی بیہقی) یعنی جس کے پاس امانت ودیانت نہیں گویا اسکے پاس ایمان ہی نہیں ۔ یہ حدیث ایک غیرامین شخص سے ایمان کی نفی کر کے امانت داری کی اہمیت کو اجاگر کررہی ہے اور کیوں نہ ہو اسلئے کہ امانت اور دیانت کا تعلق انسان کی حیات کے تمام اہم ترین شعبوں سے ہے۔ ایک مسلمان اگر امانت داری کی عمدہ صفت کو اپنائے تو وہ معاشرہ کا نہ صرف یہ کہ ایک بہترین فرد بن جائیگا بلکہ خدا اور اس کے رسول کے یہاں بھی اس کا مرتبہ بلند سے بلندتر ہوتا چلا جائیگا۔

اسلئے کہ امانت داری کا تعلق صرف روپے پیسے کے لین دین تک محدود نہیں بلکہ اسکا مفہوم بڑی ہمہ گیر وسعت کا حامل ہے جو عبادات سے لیکر معاملات تک کو شامل ہے مثلاً یہ ہماری زندگی اور یہ ہمارا جسم خاکی اللہ کی ایک امانت ہے جو اس نے ہم کو کچھ مدت کے لئے عطا فرمائی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امانت کو امانت دینے والے مالک اور رب کے کہنے کے مطابق رکھیں اور اسکی مرضی کے مطابق اسکو استعمال کریں اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے اس کی دی ہوئی امانت میں خیانت کی۔ مثلاً یہ ہماری آنکھیں اسکی امانت ہیں اور یہ اسلئے ہمکو دی گئی ہیں کہ ان سے ہم اُسکے آثارِ قدرت کا مشاہدہ کر کے اپنے یقین کو کامل کریں اسکی طرف سے آئے ہوئے قرآن وسنت کے احکامات کو بغور دیکھیں

اور ان پر عمل کریں، اگر ہم نے ان کو قرآن و حدیث یا دیگر علوم کے پڑھنے میں استعمال کرنے کے بجائے گندے، لغو یا فحش مضامین، رسائل، جرائد یا کتابیں وغیرہ پڑھنے میں صرف کیا تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے اس کی امانت میں خیانت کر کے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اسی طرح کان اسکی امانت ہیں، انکو اچھی اچھی باتوں کے سننے میں لگانا چاہیئے، زبان بھی اس کی امانت ہے، اسکو اللہ اور اسکے رسول اور اسکے محبوبوں کے ذکر سے ہمیشہ تر رکھا جائے، دست و بازو بھی اس ہی کی امانت ہیں جن کو اسکے مالک کی مرضی کے مطابق مخلوق خدا کی نفع رسانی میں لگایا جائے لہٰذا اگر کسی نے زبان سے کسی کو گالی دی یا ایسی بات بھی کر دی جس سے اسکا دل دکھ گیا، جھوٹ بولا یا کسی کی غیبت اور بدگوئی کی تو گویا اس نے امانت میں خیانت کی۔ اسی طرح کان سے کسی کی برائی سنی یا بے تکی لغو اور فحش باتیں سنیں اور ہاتھ سے کسی شخص کو ایذا دی تو گویا وہ بھی خیانت جیسے گھناؤنے جرم کا مرتکب ہوا۔

اور صوفیاء کرام تو بڑی پیاری بات فرماتے ہیں: کہ دل بھی اسکی امانت ہے لہٰذا اسمیں بھی اسی خالق و مالک اور اسکے رسول کی محبت کے سوا کسی غیر کی محبت نہیں ہونی چاہیئے، اگر ہوئی تو امانت میں خیانت ہونے کے باعث اسکا ایمان کامل نہ رہا اسی لئے ایک حدیث میں آنحضرت کا صاف ارشاد ہے کہ اسوقت تک کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسکو اسکے ماں باپ اولاد غرض تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان) بہر حال امانت کا وسیع مفہوم ہے اور مندرجہ بالا مفہوم کے علاوہ اسکا اطلاق اور بھی چند امور پر آتا ہے جن میں سے بہت سے احادیث

سے ثابت ہیں ۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے مشورہ لیا جاتا ہے دراصل اسکو امانت سپرد کی جاتی ہے۔ (ادب المفرد بخاری باب المنشار مؤمن) اسکا مطلب ہے کہ اگر کوئی تم سے مشورہ لے تو اسکی بات اڑاتے نہ پھرو، اسکا راز فاش نہ کرو کہ یہ راز بھی تمہارے پاس اس کی امانت ہے، اگر کسی کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے تو اسکا جوں کا توں مالک کو واپس کرنا بھی امانت ہے، اگر کسی نے آپ سے کوئی مشورہ مانگا تو اسکو صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے ۔اگر کوئی کسی کا نوکر یا ملازم ہے تو اسکو اپنی ڈیوٹی پوری پورے وقت میں پوری تندہی کیساتھ کرنا بھی امانت داری میں شمار کیا جائیگا اسی طرح حکام کیلئے یہ رعایا بمنزلہ امانت ہیں انکے دکھ سکھ کا خیال رکھنا اللہ کی ایک عظیم امانت کا پاس کرنا ہوگا جسکی ذمہ داری اللہ نے تم پر ڈالی ہے۔

تقوے کے فوائد

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا مانگا کرتے تھے کہ ''اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہدایت کا، تقوے کا، پاکدامنی اور غنیٰ کا (جامع الترمذی ابواب الدعوات ص ۲۰۸) اس سے معلوم ہوا کہ ''تقویٰ'' بڑی اہم اور عظیم چیز ہے کیونکہ خود نبی رؤف و رحیم اس کو خدا کی بارگاہ سے دعائیں مانگ کر طلب کرر ہے ہیں۔ ظاہر ہے جس چیز کو مصطفیٰ خدا کی بارگاہ سے مانگیں گے وہ چیز بہت ہی قیمتی اور گراں ہوگی، بے شمار فوائد اور ثمرات سے مالا مال ہوگی، اس لئے بے کار اور بے فائدہ چیز تو حضور کبھی مانگ نہیں سکتے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ تقویٰ میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں، لیکن اس سے پہلے ضمناً یہ سمجھتے چلیں کہ تقوے کے کیا معنی ہیں اور اس کی کیا حقیقت ہے۔

دراصل تقوے کے لغوی معنی ''بچنے'' کے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کے معنی یہ ہیں انسان خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے نفس کو ہر اس اقدام سے بچائے اور محفوظ رکھے جو خدا کی ناراضگی کا سبب ہو۔ یہ ایک ایسا عام مفہوم ہے جو انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہے، خواہ وہ عبادات ہوں، معاملات ہوں، تجارت ہو، امور خانہ داری ہو، ملکی معاملات ہوں یا بین الاقوامی تعلقات ہوں غرض ہر قسم کے دینی اور دنیوی امور کو خدا اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق چلانے کا نام تقویٰ ہے۔ لہذا انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ تقوے سے باہر نہیں ہوسکتا، اسی لئے قرآن میں ''تقوے'' کو لباس کے ساتھ تعبیر کرتے ہوئے فرمایا گیا

کہ ''ولباس التقوٰی ذالک خیر '' کہ تقوے کا لباس سب سے اچھا لباس ہے تو تقوے کو یہاں لباس سے اسی لئے تعبیر کیا گیا کہ جس طرح انسان ظاہری لباس سے کبھی باہر نہیں ہوسکتا، اسی طرح ''تقوٰی'' جو اس کے لئے معنوی لباس ہے اس سے بھی وہ کبھی باہر نہیں ہوسکتا۔

''تقوٰی'' حاصل کرنے والے انسان کو دنیا اور آخرت کے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ دنیاوی فوائد تو یہ ہیں کہ جب وہ خدا کے احکام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کی زندگی خوشگوار گزرے گی بلکہ اس کے ساتھی اور دوست، اس کے ہمسائے اور پڑوسی بھی اس سے فرحت اور سکون پائیں گے اور پھر جب معاشرے کا ہر فرد تقوے والا بن جائے گا تو پورا معاشرہ سکون اور طمانیت کا گہوارہ بنتا چلا جائے گا۔ پھر وہ ایسا پاکیزہ معاشرہ ہوگا جہاں چوری کا ڈر ہوگا نہ ڈاکے کا، نہ فتنہ وفساد کا خوف ہوگا نہ قتل وقتال کا، نہ عزتوں کے لٹنے کی فکر ہوگی نہ عفتوں کے تار تار ہونے کی بلکہ ہر شخص تقوے کے باعث ایک دوسرے کا ہمدرد وغمگسار، معین ومددگار بن جائے گا۔ دنیاوی فوائد میں سے ایک عظیم فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ اس متقی انسان کی تمام مشکلیں اور مصیبتیں آسان ہوتی چلی جائیں گی اس لئے کہ قرآن کا ارشاد ہے ''**واللہ ولی المتقین**'' کہ اللہ تقوے والوں کا دوست ہے، تو جب وہ کائنات کا رب، وہ احکم الحاکمین اس کا دوست بن گیا پھر بھلا اس کے لئے کونسی مشکل باقی رہ سکتی ہے۔

اخروی فوائد میں متقی کو ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوگا کہ جنت اور جنت کی تمام نعمتیں اس دن اس کے لئے ہونگی، چنانچہ قرآن کا واضح اعلان ہے کہ ''ان

المتقین فی جنات ونعیم" کہ بے شک تقوے والے باغوں اور نعمتوں میں گھرے ہوئے ہونگے ، اور پھر ایک سچے مسلمان کے لئے جنتوں کی کیا حقیقت ہے؟ اس کے لئے تو سب سے بڑی چیز خدا کی رضا اور خوشنودی ہے، تمام کام اسی لئے کرتا ہے تاکہ اس کا رب اس سے خوش ہو جائے ، اب خدا کی طرف سے بھی اس کے لئے خوشخبری سنادی جاتی ہے کہ "**فان اللہ یحب المتقین**" کہ بیشک متقین یعنی تقوے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک مومن کے لئے اور کیا خوشخبری ہوگی کہ خدا نے اس کو اپنا محبوب بنا لیا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی تمام نعمتوں کا صلہ مل گیا، خدا کی رضا اور خوشنودی کیا ملی آج اس کو دونوں جہاں کی دولتیں مل گئیں۔ اور پھر یہی نہیں کہ صرف خدا کی محبت اس کو مل گئی بلکہ خدا کے محبوب بن جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ پھر خدا کے تمام بندے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، مخلوق خدا کے قلوب اس کی عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

اور یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس کو صحیح مسلم نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب اللہ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اپنے مقرب فرشتے جبرئیل سے فرماتا ہے کہ اے جبرئیل! مجھے فلاں بندے سے محبت ہوگئی ہے تو بھی اس سے محبت کر، چنانچہ جبرئیل پھر اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور آسمانوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص سے اللہ کو محبت ہے، اے آسمان والو تم بھی اس سے محبت کرو چنانچہ تمام اہل سماء اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر زمین پر اس بندے کی

مقبولیت رکھ دی جاتی ہے جس کے باعث بندگان خدا کے دل خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خواجہ نقشبند، حضرت امام ربانی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری، شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے بزرگان دین کے نام کا آج بھی عالم میں ڈنکا بج رہا ہے، جو دلیل ہے اس بات کی کہ خدا نے ان کو اپنا محبوب بنالیا تھا۔

نماز کی اہمیت

انسان کسی دنیاوی حاکم یا بادشاہ کے دربار میں کسی طرح رسائی حاصل کرنے کیلئے بے چین و بے قرار رہتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے کہ مسلمان کتنے خوش نصیب ہیں کہ انکو کائنات کے رب، بادشاہوں کے بادشاہ، اس احکم الحاکمین اور رب العلمین کی بارگاہ بے کس پناہ میں نماز جیسی عبادت کے ذریعہ دن اور رات میں پانچ مرتبہ حاضری نصیب ہوجاتی ہے، اور وہ اسکے ذریعہ اپنے رب سے مناجات بھی کرلیتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سب سے زیادہ محبوب عبادت تھی اور آپ بلال کو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "**اقم الصلوٰۃ یابلال ارحنا بھا**" (مشکوۃ باب القصد فی العمل) یعنی اے بلال آذان دوتا کہ ہم نماز پڑھکر راحت و مسرت حاصل کریں، اور جب آپ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کیف و مسرت کے ساتھ ساتھ انتہائی خشوع وخضوع کو اختیار فرماتے تھے کیونکہ جب ادنیٰ سے کسی دنیاوی حاکم اور بادشاہ کے دربار میں وہاں کی حاضری کے آداب ملحوظ خاطر رکھے جاتے ہیں تو پھر احکم الحاکمین کی بارگاہ میں وہاں شایان شان آداب کا کیوں نہ لحاظ رکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی یوں تصویر کشی فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان بیٹھ کر باتیں کرتے تھے اور ہم ان سے باتیں کرتے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تھا تو گویا آپ ایسے ہوجاتے تھے جیسے نہ آپ ہم کو جانتے ہوں نہ ہم آپکو (مکاشفۃ القلوب

للامام غزالی ص ۱۱۰)۔

اس حدیث میں اس بارگاہ لم یزل کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کے شوق اور رغبت کا بیان ہے جبکہ حاضری کے بعد جو آداب حاضری آپ ملحوظ رکھتے تھے اسکا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ایک روز ابوجہم نے ایک سیاہ چادر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی آپ نے اسکو اوڑھ کر نماز پڑھی لیکن نماز میں آپ کی توجہ چادر کی خوبصورتی کی طرف ہوگئی تو نماز سے فارغ ہوکر آپ نے فوراوہ چادر اتاردی اور صحابہ سے فرمایا کہ یہ چادر واپس ابوجہم کو دے دو کیونکہ اس نے مجھے نماز سے غافل کردیا مجھے تو سادی چادر دے دو۔ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ ج ۱ ص ۴) اس حدیث سے جہاں بارگاہ الہٰی میں حاضری کے آداب کا پتہ چلا وہاں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دنیا کے وہ تمام کام ،مصروفیتیں ،امور ،غرض وہ تمام چیزیں جو تمہارے دل سے خدا کی یاد کو ختم کردیں اور تمہیں خدا سے غافل کردیں وہ سب تمہارے لئے حرام اور باعث عذاب ہیں اور وہ کام جو تمہیں خدا سے غافل نہ کریں بلکہ خدا سے ملادیں وہ دنیاوی کام بھی تمہارے لئے باعث رحمت وثواب ہیں بلکہ عبادات ہیں اور نماز یہ تو وہ عبادت ہے جو خدا کو بھی سب سے زیادہ محبوب ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ" اگر خدا کو نماز سے زیادہ کوئی اور عبادت محبوب ہوتی تو فرشتوں کو اسکے لئے مقرر کرتا حالانکہ ان کے لئے صرف نماز کے افعال مقرر کئے ہیں یعنی کوئی رکوع کررہا ہے تو کوئی سجدے میں ہے تو کوئی کھڑا ہے اور کوئی بیٹھا ہے۔

یوم الحج

یوم الحج یعنی حج کا دن بڑا مبارک اور مسعود دن ہے اللہ تعالیٰ اس مبارک دن میں اپنے بندوں کو اپنے پاس بلا کر ان پر جو انعامات و اکرامات کی بارش کرتا ہے اسکا اندازہ اس حدیث مبارک سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کیسامنے عرفہ کے دن وقوف کرنے والے بندوں پر فخر اور ناز کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے ملائکہ دیکھو میرے بندوں کو میرے پاس پراگندہ بال اور غبار آلودہ حالت میں لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہوئے اور گریہ وبکاء کی چیخوں سے شور مچاتے ہوئے دور دراز سے دوڑتے ہوئے آرہے ہیں۔ میں تمہیں گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ میں نے اپنے ان تمام بندوں کو بخش دیا، ان کے تمام گناہوں کو معاف کر دیا فرشتے عرض کریں گے کہ اے رب اس مجمع میں تو فلاں مرد اور فلاں عورت بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ میں نے ان کو بھی بخش دیا (مشکوٰۃ باب الوقوف بعرفہ) اسپر حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حضور کا ارشاد ہے ''**وھم قوم لا یشقی جلیسھم**'' کہ یہ خدائی صالح بندے وہ ہوتے ہیں کہ انکے ساتھ رہنے والے بھی تر جاتے ہیں، اور انکے صدقہ میں انکی بھی بخشش اور مغفرت ہو جاتی ہے اور مغفرت بھی اس شان کی ہوتی ہے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ اگرچہ اسکے گناہ ریت کے ذروں کے برابر کیوں نہ ہوں اس روز اس رحیم و کریم کے دریائے رحمت و بخشش میں سب بہتے چلے جائیں گے (طبرانی، بزاز) اور نہ صرف یہ کہ اسکے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ اگر وہ صدق دل سے کسی کی سفارش بارگاہ خداوندی میں کرے

تو اسکے بھی خدا گناہ معاف فرما دیگا (طبرانی، بزاز) یہ تو ان لوگوں کا حال اور ان لوگوں کی شان ہے جو اسوقت خدا کے مہمان ہوتے ہیں اور حرم شریف کی عفو بار فضاؤں میں سانس لے رہے ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو دور افتادہ، مکہ و مدینہ سے بہت دور دراز علاقے میں ہوں لیکن دل میں یاد الٰہی کی دیپ جلائے اور عشق مصطفیٰ کی شمع فروزاں کیئے ہوئے عفو خداوندی کے امید وار ہوں اور رحمت الٰہی کے طلبگار ہوں تو خدا کی بیکراں رحمت انہیں بھی اپنے آغوش میں لے لیتی ہے اور اسے بھی مژدۂ مغفرت سے سرفراز کر دیا جاتا ہے، لیکن اسکے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ وہ شخص اپنے آپ کو اس دن گناہوں سے محفوظ رکھے چنانچہ آنحضرت روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا کہ جو شخص عرفہ کے دن اپنے کان آنکھ اور زبان کی حفاظت کریگا تو اللہ تعالٰی اسکی مغفرت فرما دیگا۔ (مسند احمد، طبرانی) خدا کے بیکراں انعامات واکرامات کے مقابلہ میں یہ شرط کوئی حیثیت نہیں رکھتی لیکن افسوس اس مبارک اور مسعود دن کو خدا کی عبادت اور اطاعت میں گزارنے کے بجائے ہم اسکو لہو ولعب اور تساہل اور کاہلی کی نظر کر دیتے ہیں، اگر ہم عزم کر لیں کہ آج کے دن خود کو گناہوں سے حتی الامکان بچائیں گے، نہ ممنوعہ چیزوں کی طرف دیکھ کر آنکھ کا گناہ کریں گے، نہ برائی، فحش اور گندی باتوں کو سنکر اپنے کانوں کا گناہ کریں گے اور نہ زبان سے کوئی غیبت، چغل خوری اور جھوٹ وغیرہ بولکر زبان کا گناہ کریں گے تو انشاء اللہ یہ دن نہ صرف ہمارے لئے دین و دنیا کی فلاح اور کامرانی کا دن ہوگا بلکہ ہمارے دوستوں اور ہم نفسوں اور رہم مجلسوں اور رہمسائیوں کیلیئے بھی راحت وعافیت، اور امن ورحمت کا پیغام بن جائیگا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام عمر کی اب آخری منزل کو پہنچ چکے تھے، بال سفید ہو گئے تھے، کمر جھک گئی تھی، جسم نحیف و ناتواں ہو گیا تھا، کمزوری اور نقاہت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ زیادہ چل بھی نہیں سکتے تھے، بس صرف اپنی عبادت گاہ اور ہیکل تک بمشکل جاتے اور عبادت کر کے واپس گھر آ جاتے تھے، یہ بڑھاپا اور اس پر زندگی کے ایک اہم غم اور ایک عظیم فکر نے آپ کو اور بھی مضمحل کر دیا تھا اور وہ غم یہ تھا کہ عمر کے اس آخری حصے میں آپ ابھی تک بچہ سے محروم تھے، آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، آپ کو یہ بات ہمیشہ محزون و اشکبار رکھا کرتی تھی کہ اب میرے بعد کون میرے اس علم و حکمت کا وارث بنیگا ؟ کون اس طوفان خیز آندھیوں میں علم کو بلند رکھے گا؟ لہذا اس گلشن نبوت کی رونق کے لئے آپ ہر وقت بارگاہ الٰہی میں دست بدعا رہتے تھے۔

اگرچہ آپ اپنے بڑھاپے اور اپنی زوجہ محترمہ کے بانجھ ہونے کے باعث اولاد سے بالکل مایوس ہو گئے تھے لیکن اب بھی خدا کی رحمت سے ناامید نہ تھے اور یہ امید ان کی اس وقت اور بھی قوی ہو گئی جب انہوں نے ایک روز ہیکل میں حضرت مریم علی نبینا وعلیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو بڑے تعجب کی ساتھ پوچھا "**یامریم انّٰی لکِ ھذا؟**" اے مریم یہ پھل اس وقت تمہارے پاس کہاں سے آئے ہیں؟ "**قالت ھو من عنداللہ**" تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ کے پاس سے آئے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کی ناامیدی امید میں بدلتی چلی گئی اور ان کو یقین ہو گیا

کہ جو ذات اس بے موسم میں مریم کو پھل عطاء کر سکتی ہے وہ اس نا امیدی کی حالت میں ''بیٹے'' کی صورت میں ہمیں ثمر حیات بھی عطاء کر سکتی ہے۔

چنانچہ آپ اسی وقت یقین کامل کے ساتھ بارگاہ الہی میں دعا کے لئے مصروف ہو گئے اور ہاتھ پھیلا کر خدا سے یوں مانگنے لگے **"قال رب هب لي من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء"** اے میرے پروردگار مجھے اپنے فضل سے پاکیزہ اولاد عطاء فرما بلا شبہ تو دعا کو سننے والا ہے۔ ادھر نبی کے ہاتھ اٹھے ادھر بارگاہ الہی میں دعا مقبول ہوتی چلی گئی، اور جب وہ محراب میں کھڑے ہوئے عبادت میں مصروف تھے تو خدا کی طرف سے ایک فرشتہ نے آکر آپ کو خوشخبری سنائی کہ آپ کے یہاں ایک لڑکا ہوگا جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ یہاں سے ہمیں یہ سبق ملا کے زندگی کے کل سے مشکل ترین حالات میں بھی ہمیں کبھی خدا کی رحمت سے نا امید نہیں ہونا چاہئے، وہ جب بے موسم پھل لانے پر قادر ہے تو نا امیدی میں ہماری امیدیں برلانے پر بھی قادر ہے، یہ وہ ہی قادر مطلق ہے جو ہر رات کی ظلمت اور تاریکی میں سے روشنی ونور کی کرنیں نکالتا ہے، تو وہ ہی ہمارے غم والم کے ظلمت کدہ میں فرحت و مسرت کی کرنیں بھی بکھیر سکتا ہے لہذا ہمیں دنیا کے بڑے سے بڑے غم واندوہ سے پریشان اور متفکر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس قادر مطلق کے حضور اس یقین کے ساتھ ہاتھ پھیلا کر مانگنا چاہئے کہ وہ ہی پریشان حالوں کی دعاؤں کو سننے والا ہے، وہ ماں باپ سے زیادہ اپنے بندوں پر شفیق ومہربان ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے، اس یقین کے ساتھ اگر ہم نے اسکے حضور دعا کی تو ان شاء اللہ ہماری دعا ضرور قبول ہوگی اور جو ہمارے لئے بہتر ہوگا اس ہی کے مطابق نتیجہ ظاہر ہوگا۔

الغرض اس فرشتہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ولادت کی بشارت بھی دی اور اس نومولود کے محاسن وکمالات کی بھی پیشن گوئی کی جس کو قرآن اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے "فنادته الملٰئكة وهو قائم يصلي في المحراب ان الله يبشرك بيحيىٰ مصدقا بكلمة من الله وسيدا و حصورا ونبيا من الصالحين" یعنی جب حضرت زکریا علیہ السلام حجرہ کے اندر نماز میں مشغول تھے تو فرشتوں نے آپ کو آواز دی کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی ولادت کی خوشخبری سناتا ہے جو شہادت دیگا اللہ کے ایک کلمہ کی، صاحب مرتبہ اور برگزیدہ ہوگا اور گناہوں سے بالکل پاک ہوگا اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔

چنانچہ اس بشارت کے عین مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام ان مذکورہ بالا محاسن اور خوبیوں کے ساتھ اس عالم میں تشریف لائے آپ کا بچپنہ عام بچوں کی طرح کھیل کود اور لہو ولعب کی نذر نہ تھا بلکہ آپ کو خدا کی طرف سے عہد طفولیت میں ہی علم وحکمت سے مالا مال کر دیا گیا تھا، چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ہے کہ بچپن میں جب آپ کے ہم عمر بچے آپ سے کھیلنے کے لئے اصرار کرتے تو آپ ان کو یہ جواب دیتے تھے کہ خدا نے مجھے لہو ولعب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اور ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ مستقبل میں عظیم انسان بننے والے کو خدا بچپن ہی سے برے اور بے فائدہ کاموں سے ہٹا کر اچھے، مفید اور عظیم کاموں کی طرف لگا دیتا ہے، اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی بچپن ہی سے علم وحکمت کا خوگر بنا کر نبوت کے عظیم بارگراں کو برداشت کرنے کا اہل بنا دیا۔ جب وہ اس عظیم منصب کے لائق ہو گئے تو تیس سال کی عمر سے قبل ہی آپ کو نبوت سے سرفراز کر دیا گیا۔

آپ کی ولادت سے قبل آپ کے اوصاف کے متعلق جتنی بشارتیں دی گئی تھیں وہ سب آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں، چنانچہ آپ کو "سید" کہا گیا جس کے یہاں معنی حلم کے بھی ہیں عالم وفقیہ کے بھی ہیں، دین و دنیا کے سردار کے بھی ہیں، شریف و پرہیز گار کے بھی ہیں اور یہ سب آپ میں بدرجہ کمال موجود تھے تقوے اور پرہیز گاری کا تو یہ عالم تھا کہ آپ نے عمر بھر شادی نہیں کی لیکن کبھی آپ کے دل میں گناہ کا خیال اور خطرہ تک نہیں آیا۔

دوسری آپ کی صفت یہ بیان کی گئی کہ آپ "حصور" ہیں۔ "حصور" اسم فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا مادہ "حصر" ہے اس کے معنی رکاوٹ کے ہیں تو حصور کے معنی یہ ہونگے کہ خدا کے نزدیک جن امور سے رکنا ضروری ہے ان سے رک جانے والا، تو یہ معنی بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام میں کامل طور پر موجود تھے کیونکہ آپ نے اپنی زندگی میں ہر اس کام سے اجتناب کیا جس کی خدا کی طرف سے ممانعت تھی حتی کہ وہ امور جو اللہ تعالی کی طرف توجہ میں رکاوٹ بنتے تھے، اس استغراق میں مخل ہوتے تھے آپ نے اپنی تمام زندگی ان سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی جیسے، شادی اور نکاح ہے کہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد انسان تمام وقت خدا کی عبادت میں صرف نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کو اب ان فرائض کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔

تو چونکہ یہ امور اور فرائض اس توجہ الی اللہ میں مخل ہوتے تھے اس لئے حضرت یحییٰ نے اپنی تمام زندگی اس سے اجتناب کیا اور کبھی بھی شادی نہیں کی بلکہ اپنی ساری زندگی کا اکثر حصہ جنگلوں اور صحراؤں میں بسر کیا اگر چہ یہ عزلت نشینی، دنیا

واہل دنیا سے انقطاع روحانی کمال حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے اور اس ہی پر عمل پیرا ہو کر بڑے بڑے انبیاء اور رسولوں نے خدا کا قرب حاصل کیا لیکن جب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے تو آپ نے اعلان فرمادیا کہ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" (کشف الخفا للعجلونی ۲/ ۵۲۸) کہ دنیا سے انقطاع، تبتل و رہبانیت کے یہ سب طریقے اسلام سے قبل تھے، اب اسلام میں اس رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں، اب کمال حاصل کرنے کے لئے قرب الٰہی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے، عروج وارتقاء کی منزلوں کو چھونے کے لئے، اب غاروں پہاڑوں میں جانے کی ضرورت نہیں، اب دوستوں اور رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اب عمر بھر شادی نہ کر کے نسل انسانی کو منقطع کرنے کی کوئی احتیاج نہیں بلکہ اس ہی دنیا میں رہتے ہوئے اللہ اور اللہ کے بندوں کے حقوق اداء کر کے سب مقام حاصل کئے جا سکتے ہیں اور عروج وارتقاء کی رفعتوں پر پہنچا جا سکتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس پر شاہد ہے کہ آپ نے تبتل اور رہبانیت کی زندگی بسر نہیں فرمائی بلکہ احباب کے ساتھ رہ کر ان کے حقوق ادا کئے، رشتہ داروں کے ساتھ رہ کر ان کا خیال رکھا، شادیاں کر کے بیویوں کے حقوق ادا کئے، اور اس ہی میں عبادت الٰہی کر کے اپنے مالک کے حقوق بھی ادا کئے اور اس طرح کامیاب اور کامل زندگی کا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف ومحاسن کا ایک درخشاں پہلو آپ کا جذبۂ خشیت الٰہی ہے، آپ ہر وقت خدا کے خوف سے لرزاں و ترساں رہا کرتے

تھے۔ خشیت الٰہی کے باعث آپ پر ہمیشہ گریہ طاری رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ابن عساکر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ خوف الٰہی میں اس قدر رویا کرتے تھے کہ روتے ہوئے آپ کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے والد حضرت زکریا علیہ السلام آپ کو تلاش کرتے ہوئے جنگل کی طرف گئے تو دیکھا پہاڑ کے دامن میں آپ بیٹھے ہوئے گریہ وزاری میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر باپ نے کہا کہ بیٹا ہم تو تیری یاد میں بے چین و پریشان سرگرداں و حیراں ہیں اور تو یہاں بیٹھا ہوا آنسو بہا رہا ہے، اس پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''اے ابا جان آپ نے ہی مجھ کو بتایا تھا کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک ایسا لق و دق میدان ہے جو خدا کی خشیت میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوسکتا اور اشک باری کے بغیر جنت تک رسائی نہیں ہوسکتی اس لئے میں رو رہا ہوں یہ سن کر حضرت زکریا علیہ السلام کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور آپ بھی خدا کے حضور تضرع و زاری میں مصروف ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''رونا'' بھی عجیب چیز ہے، خدا کی محبت اور اس کی خشیت میں جب بندہ روتا ہے تو اشکوں کی برسات سے اس کے تمام گناہ دھلتے چلے جاتے ہیں اور خدا کی رحمتیں اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں، اور اقبال کا مرشد رومی تو اس کا خوب فلسفہ بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ ؎

ہر کجا آب رواں خضرت بود

ہر کجا اشک رواں رحمت بود

یعنی جہاں پانی رواں ہوتا ہے وہاں سبزہ لہرانے لگتا ہے اور گل و گلزار کھل اٹھتے ہیں، اور جہاں آنسوؤں کا پانی رواں ہوتا ہے وہاں رحمت خداوندی کے پھول

کھلنے لگتے ہیں، قلب کی ظلمتیں چھٹتی چلی جاتی ہیں اور سرور سے فضا معمور ہو جاتی ہے۔اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضوان اللہ تعالیٰ علیہما کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی آنکھوں سے اکثر اشکوں کی برسات جاری رہتی تھی، حتیٰ کہ بعض دفعہ تو ایسا غلبہً حال ہوتا تھا کہ روتے روتے آپ کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ بہر حال حضرت یحییٰ علیہ السلام خدا کے برگزیدہ نبی تھے جو ہمہ وقت خدا کی یاد میں مستغرق اس کے خوف اور محبت میں گریاں وترساں رہا کرتے تھے۔آپ نے جب اعلاء کلمہ حق کیا، معبودان باطلہ کی مخالفت کر کے ایک معبود برحق کی طرف لوگوں کو بلایا، توریت کے اسباق یہود کو یاد دلانے شروع کئے تو یہ قوم آپ کی جان کی دشمن اور آپ کے خون کی پیاسی ہوگئی۔

اس زمانہ میں چوتھائی ملک کا بادشاہ اور حاکم ہیرودیس رومی تھا اس کے اپنے بھائی فیلیوس کی بیوی سے ناجائز تعلقات تھے۔حضرت یحییٰ علیہ السلام حاکم وقت کو اس کے ان قبیح اور ناپاک افعال پر تنبیہ فرمایا کرتے تھے جو اس کو بڑی ناگوار گزرتی تھی آخر روز روز کی نکتہ چینی سے تنگ آکر اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قید کرا دیا۔ ہیرودیس کی محبوبہ اس کو ہمیشہ حضرت یحییٰ کے خلاف سخت انتقامی کاروائی کرنے پر اکساتی رہتی تھی لیکن وہ ہر بار ٹال جاتا تھا، ایک روز جبکہ اس کی سالگرہ کا دن تھا، عیش و عشرت کی محفل گرم تھی، اس کی محبوبہ کی لڑکی نے اپنے رقص و سرود سے اس حاکم کو ایسا مسحور کیا کہ وہ خوشی میں یہ قسم کھا بیٹھا کہ تو جو مانگے گی تجھے وہی دیا جائے گا، اس نے اپنی ماں کے اشارے پر طلب کیا تو یہ کہ اس کو حضرت یحییٰ کا سر چاہیئے، حاکم وقت نے اپنی قسم کو پورا کرنے کی خاطر جلاد کو حکم دیا جس نے حضرت

یحییٰ کو قتل کر کے آپ کا سر ایک طشت میں رکھ کر حاکم کے سامنے پیش کر دیا۔ اور یہ ایک نہیں نہ جانے کتنے خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کو اس قوم نے اسی طرح تہ تیغ کیا تھا۔

چنانچہ قرآن ان کی اس سفا کانہ روش کو یوں بیان کرتا ہے کہ "ان الذین کفروا بآیات اللہ و یقتلون النبیین بغیر حق و یقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس فبشرھم بعذاب الیم" جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں جو ان کو انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو ان کے لئے دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ پھر ان پر وہ وہ عذاب نازل ہوئے کہ جس کو سن کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ قوم یہود جس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کیا تھا اللہ نے اس کی سزا میں ان کو زمین میں دھنسا دیا۔

آج بھی بعض لوگ علماء اور اولیاء کی توہین اور گستاخیاں کرتے ہیں ان کو تکلیفیں اور ایذائیں پہنچاتے ہیں وہ خدا سے ڈریں اور توبہ کریں کہیں وہ بھی اس وعید میں شامل ہو کر خدا کے دردناک عذاب کے مستحق نہ بن جائیں اس لئے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے یہ علماء عظام اور اولیائے کرام حضرت یحییٰ علیہ السلام اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے مثل ہیں خود سرکار رسالتمآب کا ارشاد ہے کہ "علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل" لہذا ان کی توہین وایذاء انبیاء کی توہین و ایذاء کی مثل ہے، جسطرح ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے اسی طرح ان عشق رسول سے سرشار علمائے حق کی تکلیف و ایذاء اور ان کی توہین بھی غضب الٰہی کا موجب ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور ثانی اثنین

اس ذاتِ ہمایوں صفات کی کیا مدحت سرائی کی جائے جس کی تعریف و توصیف خود خدا اور خدا کا حبیب کرتا ہو، جس کے خلوص و وفا، جود و عطاء، اعمال بے ریا، اور عشق مصطفیٰ پر جہاں آیات قرآنی صدائے تحسین بلند کر رہی ہوں، اور وفور محبت میں دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے خود اقوال مصطفیٰ جسکی عزت و افتخار کو رشک صد جہاں کر رہے ہوں اس کی مدح و ثناء کس کے بس کا کام ہے ایسی جامع و کامل ذات کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کیلئے میرے نزدیک پروردۂ آغوش نبوت، کان حیاء و مروت، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ کی زبان فیض ترجمان سے آپ کی تعریف میں نکلے ہوئے یہ الفاظ نقل کر دینا کافی ہے کہ "**وعن عمر رضی اللہ تعالی عنہ قال ابوبکر سیدنا وخیرنا و احبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**"

ترجمہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں'' (مشکوۃ شریف بحوالہ ترمذی ص ۵۵۵)۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی رمز شناس اور حقیقت بین نگاہ نے اس مرد با خدا پر آقائے دو جہاں سرور کون مکان کے الطاف و عنایات کی بارشیں برستی دیکھ کر ان چند کلمات میں حقیقت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اور اس با جمال و با کمال شخصیت کی تعریف کو ان دو کلموں میں جس طرح سمو کر

رکھ دیا ہے وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے، وہ عمر، جس کو مصطفیٰ علیہ التحیۃ والتسلیم نے بارگاہ رب العزت سے دامن طلب پھیلا پھیلا کر مانگا تھا، وہ پیاری اور محبوب ذات یوں گوہر افشانی فرمائے کہ "**احبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**" کہ نگاہ نبوت میں سب سے زیادہ محبوب شخصیت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے تو اس سے بڑھ کر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ عمر نے سچ فرمایا کہ بارگاہ رسالت کی محبوب ترین ذات ابوبکر ہے، اس لئے کہ جب ایک محبّ عشق و محبت میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی نظر میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہیں رہتا، اس کی زندگی کا اولین و آخرین مقصد صرف اور صرف محبوب کی ذات بن جاتی ہے، بلکہ جب اس کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ:

تیری آرزو میں جینا تیری جستجو میں مرنا
یہی میری زندگی ہے یہی میری بندگی ہے

تو اب وہ ''محبّ'' سے ''محبوب'' بن جاتا ہے اور ''محبوبیت'' کے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو کر وہ اپنے محبوب کی نگاہِ لطف و کرم کا تارہ بن جاتا ہے یہی حال اس ''صدّیق عتیق'' کا ہے جنہیں اپنے آقا و مولیٰ روح کائنات، جان موجودات صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ والہانہ محبت تھی جس کی نظیر تاریخ عالم کے صفحات پر ملنی مشکل ہے جس کا کچھ نقشہ علامہ اقبال نے یوں کھینچا ہے کہ:

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کیلئے ہے خدا کا رسول بس

پھر ایسا محبّ باوفا، ''محبوب بیت مصطفےٰ'' کی خلعتِ فاخرہ سے اگر سرفراز نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟ اس ہی حقیقت کا اعتراف علی المرتضیٰ شیر خدا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واشگاف الفاظ میں یوں بیان فرمایا ایک روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی اور آپ کے جسم اطہر پر چادر ڈال دی گئی تو اس جان کاہ خبر سے تمام مدینہ میں کہرام مچ گیا اہل مدینہ کی آہ وفغاں سے مدینۃ الرسول کی درودیوار لرز اٹھیں، اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور آپ یہ فرمارہے تھے کہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" آج خلافت نبوت کا خاتمہ ہوگیا'' یہاں تک کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جسم اطہر کے پاس پہنچے اور آپ نے فرمایا ''اے ابوبکر آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے، آپ ان کے مونس تھے، آپ ان کے مرجع ومعتمد تھے، اور آپ کے راز دار و مشورہ دینے والے تھے، آگے فرمایا کہ، آپ سب سے زیادہ بارگاہ رسالت میں مقرب تھے، اور اطوار و عادات، بزرگی وشرافت کے لحاظ سے سب سے زیادہ رسول خدا کے مشابہ تھے۔ (ازالۃ الخفاء ص ۱۴۹)۔

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ کیا تم نے ابوبکر کی تعریف میں کچھ اشعار کہے ہیں، تو شاعر رسول اللہ، المؤید بروح القدس نے جواب دیا کہ جی ہاں! یارسول اللہ یہ اشعار میں نے ان کی مدح میں کہے ہیں۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد

وطاف العدو بہ اذ صعد الجبلا

وکان حب رسول اللہ قد علموا

من الخلائق لم یعدل بہ بدلا

ترجمہ: جس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بلند و بالا پہاڑ پر تشریف لے گئے اور دشمنوں نے آپ کا محاصرہ کر لیا تو اس وقت غار میں حضور کے ''ثانی اثنین'' یہی ابوبکر صدیق تھے، اور سرور کائنات کو جو ان سے محبت تھی وہ سب پر عیاں ہے، کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے اور یہ تو وہ ذات ہے کہ آقائے دو جہاں کی نگاہ میں اس کا بدل کوئی نہیں ہے'' آگے روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ یہ اشعار سنا چکے تو مصطفٰے علیہ التحیۃ والتسلیم نے خوش ہو کر تبسم فرمایا، فرحت و مسرت کے باعث آپ کے لبہائے مبارک پر مسکراہٹ پھیل گئی (ازالۃ الخفاء ص ۲۲۴)

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ
گئی

یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ محبوبیت کے جس اعلی و ارفع مقام پر فائز تھے اس سے تمام صحابۂ کرام بخوبی آشنا بلکہ اس کے معترف تھے اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت کے اظہار اور ان کی تعریف سے مسرور ہوا کرتے تھے لہذا آج اس یار غار کی جو تعریف کرے گا یا ان کی مدح وثناء کی محفلوں میں کسی طرح سے حصہ لے گا تو محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور

خوشنودی کا مستحق بن کر سعادت دارین سے سرفراز ہوگا۔

لیکن یاد رکھیۓ ''محبوبیت'' کے اعلیٰ وارفع مقام تک رسائی سے پہلے انتہائی کٹھن اور جگر سوز حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، بڑے دردناک مصائب اور صبر آزما واقعات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، مال واولاد حتی کہ ''جان'' جیسی متاع عزیز تک کو محبوب پر قربان کردینے کے سخت ترین امتحان سے بھی گزرنا پڑتا ہے، اگر ان تمام پر خطر وادیوں سے وہ کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے تو پھر مژدہ ہے اس کے لئے خلوت کدۂ یار کے دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور مبارک ہو اس کو کہ اب آغوش محبوب اس کے لئے وا ہے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کو بھی اس مقام محبوبیت تک پہنچنے کے لئے زندگی کے سخت ترین امتحانات سے دوچار ہونا پڑا۔

جب محبوب خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لئے صحابہ کو مال و دولت لانے کا حکم دیا تو یہی ایک محبّ صادق، صدیق باوفا تھا جو گھر سے سب کچھ سمیٹ کر لے آیا اور تمام کا تمام گھر کا اثاثہ اپنے محبوب کے قدموں میں لاکر ڈالا اور جب مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ ''گھر میں کیا چھوڑا؟'' تو وہ محبّ جس کے ''نہاں خانہ دل'' میں سوائے ''محبوب'' کے کچھ نہ تھا اس کے دل کی گہرائیوں سے یہی صدا بلند ہوئی کہ ''یارسول اللہ آج یہ میرا ''غریب خانہ'' میرے ''خانہ دل'' کا آئینہ دار ہے، جس طرح میرے دل میں سوائے خدا اور اس کے رسول کے کچھ نہیں ہے اس ہی طرح آج اس گھر میں بھی سوائے اس کے اور کچھ باقی نہیں ہے اس مقام عشق کو مولانا روم علیہ الرحمہ یوں بیان فرماتے ہیں

خانہ دامن وافتم از نیک و بد

خانہ ام پر ہست از عشق احد

اسی مضمون کو عارف رومی نے دوسرے مقام پر اپنے دل کش و دلربا انداز میں یوں ظاہر فرمایا کہ

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت

ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

غرضکہ اسلام کے اس فرزند جلیل نے اپنا تمام مال و دولت جو تقریبا چالیس ہزار درہم اور بروایت دیگر اسی ہزار درہم تھا اپنے آقا و مولیٰ والی دو جہاں کے نام پر قربان کر کے اس امتحان میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ اس محب صادق کی اس بے ریا اور مخلصانہ پیشکش اور اس عظیم مالی قربانی کو بارگاہ رسالت میں کس شان کے ساتھ حلہ قبولیت سے نوازا گیا اس کا اندازہ مخبر صادق روحی وقلبی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ "جس کسی نے ہمیں کچھ دیا ہم نے اس کا بدلہ ادا کر دیا، سوائے ابوبکر کے کہ اس نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا ہے اور وہ نیکی و بخشش کی ہے کہ اس کا بدلہ قیامت کے دن خود خدا تعالیٰ ہی دے گا، اور کسی شخص کے مال نے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر کے مال نے پہنچایا ہے۔

یہ تو مالی قربانی کے بارے میں "تمغہ قبولیت" جو بارگاہ نبوت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عطاء ہوا، جس سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ اس کٹھن اور پرخطر

وادی کو ابو بکر نے کامیابی کے ساتھ طے کر لیا، لیکن ابھی ''قربانی جان'' سے دریغ نہ کرنے کا ایک اور اہم دشوار گزار مرحلہ باقی ہے آیئے! ذرا دیکھیں کہ اس آگ کے سمندر کو ابو بکر نے کس طرح عبور کیا، اور خود کو اس ہوشربا اور جانکاہ امتحان میں کس طرح کامیابی سے ہمکنار کیا، اور کن کن دلدوز اور جگر پاش مصیبتوں سے دوچار ہو کر بارگاہ مصطفے میں محبوبیت کا مقام حاصل کیا۔

دشمنان اسلام کی ایذاء رسانیوں اور اذیت ناکیوں نے جب خدا کے حبیب کے لئے مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا تو نبوت کے تیرہویں سال وحی الٰہی کے مطابق آپ نے ''مدینۃ المنورہ'' ہجرت کرنے کا عزم فرما لیا، اس پر خطر اور مخفی سفر میں آپ نے اپنی رفاقت اور ہمراہی کا اگر کسی کو شرف عطاء کیا تو وہ یہی ''صدیق باوفا'' کی ذات تھی، نور مجسم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں اپنے وفا شعار رفیق، ابو بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے، راستہ بڑا سنگلاخ تھا، نوکیلے پتھر سرکار کے نرم و ملائم قدمہائے مبارک کو زخمی کر رہے تھے کہ اس وقت، اس صدیق جاں نثار سے یہ دیکھا نہ گیا اور آپ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور اپنے پیروں کے لہولہان ہونے کی پرواہ تک نہ کی اس لئے کہ یہ عشق کا ایک مقام ہے۔

گر بریزد خون من آں دوست رو
پائے کوباں جاں بر افشانم برو

بہر حال اس طرح سے مکتب عشق کا یہ ہونہار فرزند اس آخری امتحان کی پہلی سیڑھی کو بھی کامیابی و کامرانی سے طے کر گیا آخر کار یہ مختصر سا قافلہ مکہ سے چار

پانچ میل کے فاصلے پر ''کوہ ثور'' پہ پہنچ گیا غار پر پہنچ کر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آقا و مولیٰ کو باہر ٹھہرا دیا، وہ غار جس میں برسہا برس سے کسی آدمی کا گزر تک نہ ہوا ہو، جو حشرات الارض اور مختلف قسم کے زہریلے جانوروں کا مسکن بنا ہوا تھا اس میں ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس خیال سے پہلے داخل ہوتے ہیں کہ کہیں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے جو گزرے پہلے مجھ پر ہی گزر جائے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ ہے وہ عشق کا مقام جہاں ابو بکر کو اپنی جان سے زیادہ مصطفیٰ کی جان عزیز اور پیاری تھی بہر حال کملی والے کا یہ قابلِ فخر اور لائق ناز صحابی پہلے خود اندر جا کر غار کو صاف کرتا ہے، تن کے کپڑے پھاڑ کر غار کے روزن بند کرتا ہے ایک روزن رہ جاتا ہے تو اس کو اپنے پیر سے بند کر کے حضور سے عرض کرتا ہے کہ یا رسول اللہ! اب آپ اندر تشریف لے آیئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی صعوبتوں کے باعث اس قدر تھک چکے تھے کہ اندر آ کر اپنا سر اقدس ابو بکر کی گود میں رکھ کر محو استراحت ہو گئے، عین اس وقت ایک زہریلا سانپ ابو بکر کے پاؤں کو ڈس لیتا ہے، شدت تکلیف کے باعث ابو بکر کی آنکھوں سے اشک بہہ نکلتے ہیں لیکن وہ جسم کو جنبش تک نہیں ہونے دیتے اس خیال سے کہ کہیں مصطفیٰ کے آرام میں فرق نہ آ جائے۔ یہ ایک اور ''تلفِ جان'' کا امتحان تھا بحمد اللہ ''صدیق عتیق'' اس میں بھی فوز و فلاح سے ہمکنار ہوتا چلا گیا۔ لیجئے اب اس سے بھی زیادہ سخت

امتحان کا وقت آتا ہے جس کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں حضور سرور کائنات اور آپ کے اصحاب، خصوصا اس یار غار کے ازلی دشمن، آپ کے خون کے پیاسے غار کے دہانہ تک آپہنچتے ہیں، اور اس قدر قریب ہیں کہ اگر وہ اپنے پاؤں کی طرف نظر ڈالیں تو سرکار پر نظر پڑ جائے، ایسے ہیبت ناک اور دہشت ناک وقت میں بھی یہ ابوبکر کی ہی ذات ہے جو یہ کہتی ہوئی مصطفیٰ کے ساتھ ہمیں نظر آتی ہے کہ "یارسول اللہ هؤلاء قومك يطلبونك اما واللہ ما علی نفسی ابکی ولٰکن مخافة ان اری فيك ما اکره" (تفسیر مظہری ص۲۱۲) یعنی یارسول اللہ! یہ آپ کی قوم آپ کی جستجو اور تلاش میں یہاں تک آپہنچی ہے، خدا کی قسم میں اپنی وجہ سے غمگین و اشکبار نہیں ہوں بلکہ اس خوف سے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف یا نقصان نہ پہنچ جائے میرا پتہ پانی ہو رہا ہے۔ اس امتحان میں بھی ابوبکر نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی بلکہ اس جانِ جہاں سرور عالم و عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر میں مخزون و اشکبار ہو کر "لاتحزن ان اللہ معنا" میں معیت خاصہ کا تاج کرامت حاصل کر کے اپنے لئے سعادت دارین کا سامان مہیا کرلیا۔

الغرض یہ ہیں وہ کوچۂ عشق کے صبر آزما اور کٹھن مراحل جن سے یہ صدیق باوفا بآسانی گزرتا چلا گیا اور راہ محبت میں قربانی جاں کے کسی موقعہ سے دریغ نہ کر کے اپنے محبّ صادق ہونے پر دلیل قائم کرگیا، اس خلوص و وفا، صدق وصفا کا اجر بارگاہ رسالت سے ابوبکر کو یہ ملا کہ محبّ سے "محبوبیت" کا مرتبہ مل گیا اور محبوب خدا کے محبوب بن گئے، جس پر یہ حدیث شاہد ہے کہ حضرت عمرو بن

العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کی یا رسول اللہ! "ای الناس احب الیک" کہ لوگوں میں سب سے زیادہ آپ کو کون محبوب ہے، تو آپ نے فرمایا کہ "عائشہ" مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، حضرت عمرو بن العاص نے پھر عرض کیا کہ مردوں میں سب سے زیادہ کون محبوب ہے، تو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ابوھا" یعنی عائشہ کا باپ ابوبکر مجھے مردوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و مسلم ص ۵۵۵)۔ یہ تو تھا وہ اجر جو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بارگاہ رسالت سے ملا، اور بارگاہ احدیت سے صدیق باوفا کو حبیب پر جاں نثاری و جاں بازی کا صلہ یہ ملا کہ ان کو "ثانی اثنین" کے خطاب سے سرفراز فرما کر ان کی وفا شعاری اور عشق مصطفوی پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے علاوہ ان کے بہت سے مدارج، خصوصیات اور کمالات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ "الا تنصروه فقد نصره الله اذاخرجه الذين كفروا ثانى اثنين، الآية" کہ جب کفار نے پیغمبر خدا کو مکہ سے نکالا تو اس وقت کون تھا جس نے ان کی مدد کی، ہاں ایسے پر خطر اور وحشتناک وقت میں ایک ان کا یار وفا شعار تھا جس نے وہاں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا، قربان جاؤں اس یار باوفا پر جس کی سچی اور پر خلوص رفاقت کی تصدیق اور اعلان "ثانی اثنین" کے لفظ سے خود قرآن نے کی ہو۔

اس ہی "ثانی اثنین" کے لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس

پرخطر وقت میں جس نے اپنے آقا اور محبوب کا ساتھ نہ چھوڑا، اور حبیب خدا کیساتھ اس تنہائی کے عالم میں اگر کوئی ''دوسری ذات'' نظر آئی اور مصطفے کا اس وقت ''ثانی'' رہی تو یہی صدیق باوفا کی ذات تھی۔ تو اب یہی ذات اس امر کے زیادہ لائق ہے کہ پیغمبر خدا کے بعد مناصب دینیہ ودنیویہ کی ادائیگی، اور تبلیغ اسلام میں بھی یہی مصطفے کا ''ثانی'' اور آپ کا جانشین وخلیفہ بنے اور اس ہی میں یہ ہمت اور طاقت بھی ہے کہ اس منصب کو بخوبی سنبھال سکے۔ چنانچہ مرض الموت میں جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کو امامت کرانے کا حکم دیا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے ان کے رقت قلب کی وجہ سے کچھ توقف فرمایا تو اس وقت سرکار نے یہ ارشاد فرمایا کہ "**لا ینبغی لقوم فیھم ابوبکر ان یؤمھم غیرہ**" کہ اس قوم کے لئے یہ بات سزاوار نہیں جسمیں ابوبکر ہوں کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور کو پھر اپنا امام بنائے۔

اسی حدیث سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یہ نکتہ اخذ فرماتے ہیں کہ جو امامت میں اولی واقدم ہے وہ ''خلافت'' میں بھی اولی واقدم ہوگا، اسی رمز کو سمجھتے ہوئے علی شیر خدا نے کہا تھا کہ "**قدمک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امر دیننا فمن الذی یؤخرک فی دنیانا**" (اشعۃ اللمعات ص ۶۵۱، ازالۃ الخفاء) کہ حضور نے جب آپ کو ہمارے دینی امور میں مقدم کر دیا تو اب کون ہے جو آپ کو ہمارے دنیوی امور میں مؤخر کرے گا بلکہ اس میں بھی آپ ہی ہمارے پیشوا ہیں۔

بہر حال ''ثانی اثنین'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہی وہ ذات ہے جو آنحضرت کی بلافصل نائب ہوگی، اور اسی میں اتنی طاقت ہے کہ اس عظیم نیابت کو سنبھال سکے اور یہ حقیقت تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت کے وصال کے بعد اسلامی نوزائدہ حکومت جن جن مشکلات سے دوچار ہوئی اور مخالفت کی ہر چہار جانب سے جو تند و تیز آندھیاں چلیں اس میں استقامت و استقلال کے ساتھ قائم رہنا اور پامردی و حوصلہ سے سب کا مقابلہ کرنا یہ ''ابوبکر صدیق'' ہی کا کام تھا۔ (جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء)۔

اس ہی ''ثانی اثنین'' کے لفظ میں اس امر کا اظہار بھی ہے کہ اس خلوت کدۂ ناز میں دلدادگانِ جمال ضیاء بار اور مشتاقانِ دیدیار میں سے ایک دیوانۂ دلفگار کو وہ ساعت ہمایوں نصیب ہوئی کہ جس میں اس نے اپنے محبوب بلکہ محبوب رب العالمین کو اپنی گود میں لٹا کر، اس ماہ وشمس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ کر "ما زاغ البصر وما طغی" کے مصداق دیکھا اور ٹکٹکی باندھکر دیکھا، اس کے جمال جہاں آراء کی دید سے اپنی تشنگی کو دور کیا، پیاسی نگاہوں کو جی بھر کے سیراب کیا، اس کے طلعت زیبا کی ضیاء بار وضوریز کرنوں سے اپنے قلب و نگاہ کو خوب منور و مستنیر کیا۔ اس ہی ''ثانی اثنین'' کے لفظ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ یوں تو ہر صحابی کو حضور اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و صحبت حاصل ہوئی لیکن وہ معیت خاصہ جس کا اظہار سرور کائنات نے "لاتحزن ان اللہ معنا" سے کیا، جس کے دامن میں لاتناہی اسرار و رموز اور انوار و تجلیات پوشیدہ تھے وہ صرف اور صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی حاصل ہوئی

کیونکہ یہی غار میں ''ثانی اثنین'' تھے یعنی یہی وہ دوسری ذات تھی جو اس خاص وقت میں غار کے اندر حبیب خدا کے ساتھ موجود تھی۔

چنانچہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں فرماتے ہیں کہ ابوبکر کی فضیلت کیلئے صرف یہ ایک بات کافی ہے کہ رسول اللہ نے خدا کی وہ خاص معیت جو اپنے لئے ثابت کی ہے اس میں ابوبکر کو بھی شامل کر لیا (تفسیر مظہری ص ۲۰۷) اسی ''ثانی اثنین'' کے لفظ میں اس امر کی طرف بھی لطیف اشارہ موجود ہے کہ وہ اوصاف وکمالات جو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے انکے ساتھ اگر کوئی متصف ہوا اور ان کمالات کا اگر کوئی مظہر اتم بنا تو وہ ''آئینہ صدیق'' تھا اور کیوں نہ ہو جب حضرت باقی باللہ اپنے خلوت خاصہ میں ایک نان بائی کو خوش ہو کر توجہ دیں تو وہ نان بائی صورت وسیرت میں آپ جیسا ہو جائے اور دروازہ کھلے تو دو ''باقی باللہ'' نظر آئیں تو یہاں بھی ان قربانیوں پر مسرور ہو کر غار کے خلوت کدہ میں اگر مرشد کریم مصطفےٰ علیہ التحیہ والتسلیم کی ایک توجہ خاصہ ابوبکر کو اپنا مظہر اتم بنا دے، اپنے کمالات کی جلوہ گاہ بنا کر ''ثانی اثنین'' کے خطاب سے نواز دے تو کونسے تعجب کی بات ہے۔

اسی ''ثانی اثنین'' کے لفظ میں اس اہم اور عظیم امر پر بھی دلالت موجود ہے کہ اس حریم ناز میں، اس وقت نیاز میں خدا نے اپنے حبیب پر جو خاص انوار وتجلیات کی بارشیں کیں، خصوصاً اس آیہ میں جیسا کہ ارشاد ہے ''**وانزل الله سكينته عليه**'' کہ نسبت سکینہ جیسی عظیم اور خاص دولت سے سرفرازی عطاء کی تو اسوقت ابوبکر کا دامن مراد بھی گوہر ہائے مقصود سے پُر ہو گیا اور ان بیش

بہا جواہر سے صدیق نے بھی اپنے خزینۂ دل کو معمور کرلیا بالخصوص وہ ''نسبت سکینہ'' قلب مصطفٰے سے ہوتی ہوئی قلب صدیق میں پہنچی اور انکو عالم سے بے نیاز کرگئی۔

صاحب عرائس البیان فرماتے ہیں کہ یہ ''نسبت سکینہ'' سب سے پہلے قلب مصطفٰے پر نازل ہوئی پھر اس نور سے قلب صدیق نے ضیاء پائی کیونکہ اس خاص وقت کی خاص تجلی کی تاب لانا یہ کسی اولوالعزم پیغمبر بلکہ صرف حبیب خدا ہی کا کام تھا قلب صدیق میں اتنی طاقت نہ تھی کہ بلا واسطہ اس نور اول کی تابانیوں کی تاب لاسکے۔ (عرائس البیان ص ۳۲۹) اور میں تو یہ عرض کرونگا کہ بواسطہ مصطفٰے ''یہ نسبت سکینہ'' دوآتشہ ہوکر جو نازل ہوئی اسکو برداشت کرنا بھی اس عالم میں کسی کا کام نہ تھا، یہ قلب صدیق ہی تھا جو اس کو سہہ گیا۔

سبحان اللہ! غور فرمائیے کہ اس سلسلہ کا پھر کیا مقام ہوگا جسمیں یہ خاص ''نسبت سکینہ'' موجود ہو اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس سلسلے کو "**افضل الناس بعد الانبیاء**" کیساتھ نسبت ہوگئی اس کے افضل اعلیٰ ہونے میں پھر کیا شبہ رہ جاتا ہے اور وہ '' سلسلہ عالیہ نقشبندیہ'' ہے کہ اسکو اس صدیق باوفا کیساتھ نسبت ہے جو بارگاہ نبوت کی سب سے محبوب شخصیت ہے انبیاء کے بعد جسکے افضل الناس ہونے میں سبکا اتفاق ہے اور جسکو خدا اور حبیب خدا کی وہ خاص معیت اور قرب حاصل ہے کہ جو بڑے بڑے صحابہ بلکہ مکینان عرش کیلئے بھی قابل صد رشک ہے اسی ذات والا صفات سے تعلق اور نسبت رکھنے والا سلسلہ پھر کیوں نہ اشرف وافضل ہوگا اسی لئے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے سر حلقہ

وپیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ

''بداز کہ طریقے کہ اقرب است واسبق واوفق واوسق واسلم واحکم واصدق واولیٰ واعلیٰ واجل وارفع واکمل واجمل طریقہ عالیہ نقشبندیہ است''۔

اسی ''ثانی اثنین'' میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ صرف اس غار میں ہی حضور کے ثانی نہیں رہے بلکہ اسلام میں بھی ثانی، بدر کے دن عریش میں بھی ثانی اور وفات کے بعد قبر میں بھی ثانی، کل قیامت کے دن حشر میں بھی ثانی، حوض کوثر پر بھی آپکے ثانی، اور جنت میں داخل ہونے میں بھی آپکے یہی'' ثانی'' ہونگے، جیسا کہ خود حضور کا ارشاد ہے کہ "**اما انك یا ابابکر اول من یدخل الجنة من امتی**" (مشکوۃ شریف بحوالہ سنن ابوداود، ص ۵۵۵) کہ اے ابوبکر تو میری امت میں سب سے پہلا شخص ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا، یہاں بھی مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دسری ذات یہی نظر آتی ہے۔ مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس مصرعے میں سب کچھ فرما دیا۔

ثانئ اسلام و غار بدر و قبر

غرضیکہ ثانی اثنین کا لفظ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وسیع کمالات اور آپ کے قرب کے انتہائی درجات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

جامع القرآن کی حیثیت سے

قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ''انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون'' کہ اس نصیحت والی کتاب کو ہم نے اتارا اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں اپنے اس وعدہ کا دوسرے مقام پر سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ یوں اعادہ فرماتا ہے کہ ''ان علینا جمعه و قرآنه فاذا قرانه فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانه'' بیشک ہمارے ذمہ اس قرآن کا جمع کرنا اور اسکا پڑھنا پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ پھر بلاشبہ ہم پر ہے اسکا کھولنا اور بیان کرنا۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ قرآن کے نہ صرف معانی بلکہ معانی اور مضامین کے ساتھ ساتھ اسکے الفاظ عبارات اور حروف تک کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے پھر بھلا جسکی حفاظت کی ذمہ داری خود خدائے بزرگ و برتر اپنے اوپر لے لے وہ چیز بھلا کیسے غیر محفوظ رہ سکتی ہے۔

چنانچہ شروع سے ہی قرآن کریم کی حفاظت کے اسباب ظاہر ہونے شروع ہو گئے سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو حافظہ ایسا عطا فرمایا کہ جو آیات حضور سے سنتے تھے وہ فوراً ضبط کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ جب پورا قرآن نازل ہو گیا تو بہت سے صحابہ ایسے تھے جنکے سینے میں

پورا قرآن محفوظ تھا چنانچہ قرطبی کا قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک جنگ کے موقعہ پر ستر (۷۰) کے قریب قرآن کے حفاظ شہید ہوئے لیکن صرف یہی نہیں بلکہ اس کی حفاظت کے لئے اور اسباب بھی فراہم کئے گئے اور وہ یہ تھے صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی قرآن کو تحریری طور پر بھی جمع کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ بخاری شریف میں حضرت قتادہ سے ایک روایت ہے کہ میں نے حضرت انس سے دریافت کیا کہ عہد رسالت میں کن کن لوگوں نے قرآن کو جمع کرلیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ چار اشخاص تھے یعنی ''ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید'' اور کسطرح جمع کیا؟ کس چیز پر تحریر کیا؟ اس کیلئے کسی روایت میں آتا ہے کہ چمڑے کے ٹکڑوں پر کسی میں آتا ہے کہ باریک اور چکنے پتھروں پر، تو کسی میں آتا ہے کہ اونٹ کے شانہ کی ہڈیوں پر، الغرض قرآن کا جب نزول ختم ہوا تو اسوقت قرآن نہ صرف سینکڑوں اور ہزاروں سینوں میں بلکہ تحریری طور پر بھی مختلف قسم کے ٹکڑوں میں موجود تھا لیکن چونکہ وہ منتشر طور پر تھا اور کسی بھی ٹکڑے یا کسی بھی حصے کے گم ہو جانے کا اسمیں امکان تھا اسلئے اس وہم اور اس شک کو بھی ختم کرنے کیلئے اللہ تعالٰی نے اسکی مزید حفاظت کا انتظام فرمایا اور اسکو ایک ''مصحف'' کی ایک کتابی شکل دینے کا عظیم اور اہم کام حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے لیا اور یہ سعادت انکو عطا فرمائی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ یمامہ کے موقعہ پر جب بہت سے حافظوں کی شہادت کی خبر حضرت ابوبکر صدیق کو ملی تو اسوقت حضرت عمر بھی

وہیں موجود تھے آپ کو ان حفاظ کی شہادت کی خبر سے بڑی تشویش ہوئی اور آپ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اے ابوبکر اگر اسی طرح جنگوں میں حفاظ کرام شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ہمارے ہاتھوں سے چلا جائیگا، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم فرمادیں۔

یہ سنکر حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے عمر جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا اسے میں کس طرح کروں؟ اس پر حضرت عمر نے جواب دیا کہ "واللہ یہ بات بہتر ہے" غرضیکہ حضرت عمر حضرت ابوبکر سے بار بار اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے انکا دل بھی کھول دیا اور وہ حضرت عمر کی رائے سے متفق ہو گئے۔

اس کام کیلئے حضرت زید بن ثابت کا انتخاب کیا گیا چنانچہ حضرت ابوبکر نے ان کو بلایا اور انسے کہا کہ تم سمجھدار نوجوان ہو علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی رہ چکے ہو لہٰذا اب یہ کام تمہارے سپرد کیا جاتا ہے تم تحقیق وتفتیش کر کے اس کو جمع کرو حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر مجھ کو پہاڑ ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینے کا حکم دیتے تو یہ بات مجھ پر اتنی گراں نہ ہوتی جسقدر قران کو جمع کرنے کا کام مجھ پر شاق گزرا ہے (انہوں نے بھی وہی کہا جو حضرت ابوبکر نے کہا تھا) ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر اور حضرت زید بن ثابت سے فرمایا کہ تم دونوں مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ پھر اسکے بعد جو شخص تمہارے پاس کتاب اللہ کا کوئی حصہ معہ دو گواہوں کے لائے تو اس کو قبول کرلو چنانچہ یہ حضرات اسوقت تک قرآن کا کوئی حصہ تسلیم

نہیں کرتے جب تک وہ لانے والا آدمی اپنے ساتھ دو گواہوں کو پیش نہ کرتا اس
سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کو مصحف میں تحریر کرتے وقت کس قدر احتیاط
ملحوظ رکھی گئی، اسلئے کہ حضرت زید خود حافظ تھے کاتب وحی تھے قرآن کو حضور کے
زمانہ میں خود لکھا تھا پھر لانے والا حافظِ قرآن ہوتا تھا اور پھر وہ
لکھا ہوا، اپنا تحریر کردہ علیحدہ لاتا تھا لیکن اسکے باوجود اس کا دو شہادتوں کا بہم پہنچانا
حد درجہ کی احتیاط تھی اور ہماری آنے والی نسلوں پر اور دیگر اقوام پر یہ واضح
کرنا مقصود تھا کہ ہماری آسمانی کتاب ہر قسم کی تحریف وتبدل سے محفوظ ہے اس میں
صرف خدا کے کلام کے علاوہ کسی کا کلام شامل نہیں ہے اور یہ ہو بھی کسطرح سکتا تھا
سلئے کہ قرآن واضح اعلان فرما رہا ہے "**وانه لكتاب عزيز لا ياتيه**
الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد" بیشک
یہ قرآن ایسی کتاب ہے جو غالب ہے اور باطل نہ اسکے سامنے سے اور نہ اسکے پیچھے
سے اس کے پاس آئے گا یہ حکمت والے اور خوبیوں والی ذات کی طرف سے
اترا ہے۔

الغرض حضرت ابوبکر وعمر کی کوششوں اور کاوشوں سے قرآن کو مختلف
ٹکڑوں سے جمع کر کے چند صحائف میں نقل کر دیا گیا اور وہ منقول صحیفے حضرت
ابوبکر کے پاس رہے انکے بعد حضرت عمر کے پاس اور انکے بعد حضرت عمر کی
صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان
کا زمانہ آ گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب قرآن کو تیسری دفعہ جمع کیا گیا، اب سوال یہ
ہے کہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی جمع تھا اسکے بعد ایک

مصحف میں ابوبکر وعمر نے جمع کر دیا اب جمع کرنے کا کیا مطلب؟ اور حضرت عثمان کو جو جامع قرآن کہا جاتا ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ تو اسکی تفصیل یہ ہے کہ عرب کی زبان بڑی وسیع ہے مختلف علاقوں اور مختلف قبیلوں کی عربی میں کافی فرق پڑ جاتے ہیں چنانچہ ہر قبیلہ نے اور ہر علاقہ کے رہنے والوں نے قرآن کو اپنی اپنی زبان میں پڑھنا شروع کر دیا جب قرآن میں اختلاف پیدا ہوا تو ہر ایک نے اپنی قرأت کی برتری ثابت کرنے کیلئے کوشش شروع کر دی حتی کہ نوبت مار پٹائی اور جنگ وجدل تک آ گئی۔

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت انس سے ایک روایت ہے کہ آرمینیہ اور آذربائیجان کی فتح کے موقع پر شامی اور عراقی دونوں ساتھ ملکر معرکہ آرائی میں مصروف تھے وہاں حضرت حذیفہ نے جب دونوں کی قرأتیں سنیں تو دونوں کی قرأتوں میں زبردست اختلاف کو دیکھ کر آپ حیران رہ گئے اور یہ بات آپ نے حضرت عثمان سے آ کر کہی کہ خدارا آپ مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی طرح باہم برسر پیکار ہونے سے بچالیں ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمان کے عہد میں قرأتوں کے درمیان اتنا اختلاف تھا کہ پڑھنے والے بچوں اور پڑھانے والے استادوں کے درمیان تلواریں چل گئیں الغرض جب ہر طرف سے افتراق او رانتشار کی خبریں حضرت عثمان کو آنے لگیں تو آپ متفکر ہو گئے اور آپ نے ایک امت میں ہونے والے اس انتشار اور افتراق کو ختم کرنے کے لئے یہ لائحہ عمل اختیار فرمایا کہ عرب کی دوسری تمام زبانوں میں قرآن کی قرأت کو ممنوع قرار دے دیا اور صرف ایک قریش کی قرأت پر سب کو تلاوت کرنے کا حکم

فرما دیا اور تحریری طور پر جتنے دوسرے صحیفے دوسری قرأتوں میں موجود تھے سبکو ختم کرنے کا حکم دے دیا۔

اور صرف ایک قریشی لغت پر قرآن کی کتابت کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں اسکی نقول بھیج دیں اور حکم صادر فرما دیا کہ اس قرأت اور لغت کے علاوہ کسی بھی لغت میں قرآن نہ پڑھا جائے اور اس ایک مصحف کی کتابت میں بھی حضرت عثمان نے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں جسمیں ایک تو یہ تھی کہ حضرت حفصہ کے گھر سے وہ صحیفے منگائے جو ابوبکر کے زمانہ میں تحریر ہوئے تھے پھر آپ نے صحابہ کبار کی ایک کمیٹی تشکیل دی جسمیں زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کو شامل کیا بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ نے بارہ معزز ارکان پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی اور انکو حکم دیا کہ ان صحائف کو سامنے رکھکر تم ایک صحیفہ تیار کرو اور جہاں تمہارے درمیان اختلاف ہو وہاں قریشی زبان کو ترجیح کرنا اور اسی لغت کو اختیار کرنا تفسیر اتقان میں ہے کہ جب کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا کہ اس کو کسطرح اور کس لغت پر پڑھا جائے تو پھر صحابہ کرام یہ سوچتے تھے کہ یہ آیت سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کو سکھائی تھی اور حضور کے سامنے کس شخص نے اسکو پڑھا تھا چنانچہ اس صحابی کی تلاش شروع ہو جاتی تھی اور جہاں بھی وہ ہوتا تھا اس کو بلا کر اس سے دریافت کیا جاتا تھا اور اسکی قرأت کے مطابق پڑھا جاتا حتیٰ کہ بعض دفعہ تو ایسے اشخاص اور ایسے صحابہ کرام کو بھی بلانا پڑ گیا جو مدینہ سے تین دن اور تین رات کی مسافت پر دور دراز شہروں میں مقیم تھے چنانچہ ان کو بھی وہاں سے بلایا گیا اور ان سے دریافت

کیا گیا کہ بتاؤتم کو یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تعلیم دی تھی جس طرح اسنے بتایا اسی طرح پھر اسکو لکھ لیا گیا۔

الغرض حضرت عثمان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے امت مسلمہ کو تفریق وافتراق اور انتشار اور پراگندگی سے بچالیا ورنہ اگر آپ ایک قرأت پر لوگوں کو جمع نہ کرتے اور مختلف قرأتوں اور لغتوں میں پڑھنے کی اجازت دیے رکھتے تو عالم اسلام میں ایسا فساد پیدا ہوجاتا جسکے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اسی وجہ سے حضرت عثمان کو جامع القرآن کہا جاتا ہے کہ آپ نے قرآن کو ایک لغت پر اور ایک قرأت پر جمع کیا اور امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک عظیم طوفان اور ایک ہولناک تباہی سے بچالیا آج جو وحدت کے حسین نظارے نظر آرہے ہیں کہ ہر مقام پر قرآن ایک ہی طرح پڑھا جارہا ہے خواہ عربی ہو یا عجمی، عراقی ہو یا شامی، مکی ہو یا مدنی، سوڈانی ہو یا حجازی، ہر ایک اسی ایک لغت قریشی پر قرآن کو پڑھتا ہے یہ سب صدقہ ہے عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کی طرف سے انکو جزائے خیر عطا فرمائے

(ماخوذ از مشکوٰۃ، فضائل قرآن، ازالۃ الخفاء، الاتقان)

..........☆.......... ختم شد ....☆..........